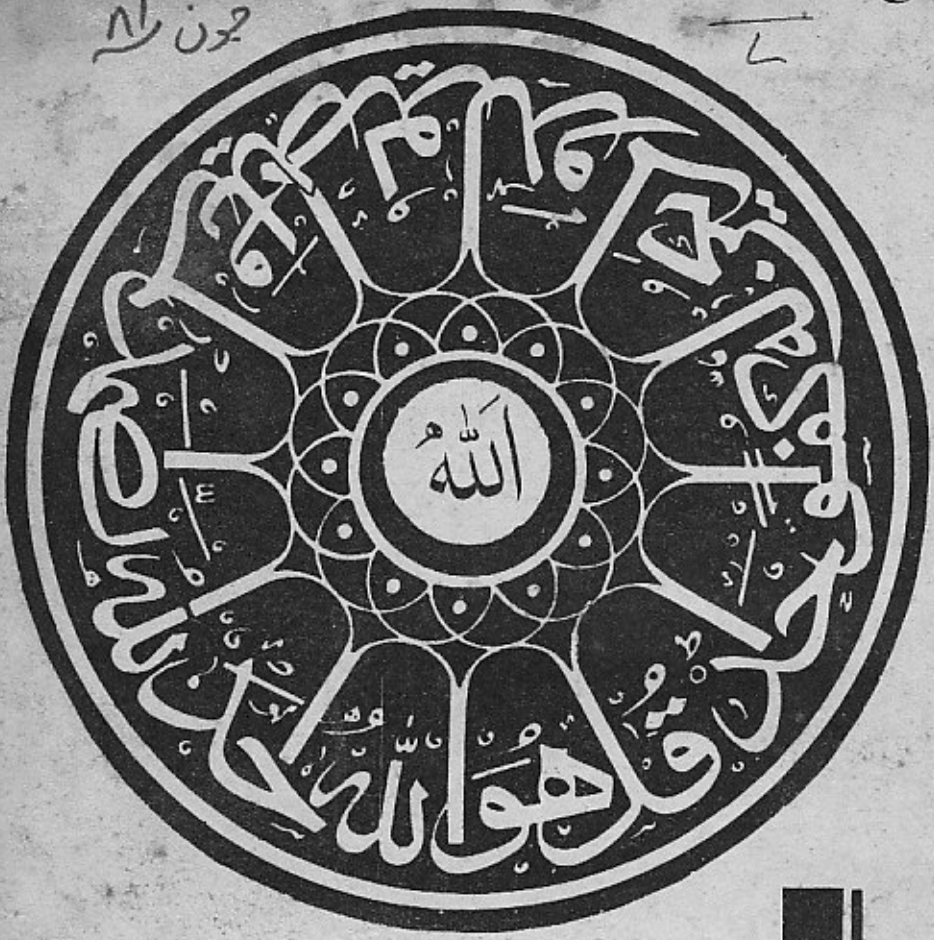

جون ۸۱

رجب ۱۴۰۱

ماہنامہ

قل هو الله احد ۞ الله الصمد ۞ لم يلد ۞ ولم يولد ۞ ولم يكن له كفوا احد

الله

الرشید

اداریہ

قومی اتحاد اور ملکی امن وسکون کا آپس میں گہرا تعلق ہے بلکہ اگر انہیں لازم وملزوم کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اتحاد کی ضرورت اور اہمیت کا احساس کسی نہ کسی درجے میں ہمیشہ پایا جاتا رہا ہے۔

قوم اس وقت جن حالات سے گزر رہی ہے ان کی وجہ سے یہ احساس اس قدر شدت اختیار کر چکا ہے کہ ہر زبان پر باہمی اتحاد کا تذکرہ جاری ہے، ہر روز نامہ میں کالم لکھے جا رہے ہیں ہر ماہنامہ میں مقالات شائع ہو رہے ہیں بلکہ ان گوشوں سے بھی باہمی اتحاد کی ضرورت کا برملا اظہار ہونے لگا ہے جو طبعاً اتحاد کے نام سے الرجک ہیں یہ صورت حالات قوم کے لئے نیک شگون ہے۔ مگر اندیشہ یہ ہے کہ اس قسم کی نعرہ بازی اور بیان بازی ہی کو کافی نہ سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ عملی اعتبار سے بیکار آدمی کی ساری قوتیں سمٹ کے زبان میں آجایا کرتی ہیں۔ افراد کی طرح جماعتیں بھی انہی حالات سے دوچار ہوتی ہیں یہ نرا اندیشہ نہیں بلکہ اتحاد کی طرف عملی طور پر کوئی پیش رفت سامنے نہیں آرہی بلکہ حال یہ ہے کہ

؎ اسکی باتوں سے اسے تو نے سمجھا ہے خضر
اس کے پاؤں کو تو دیکھ کہ کدھر جاتے ہیں۔

باہمی اتحاد کے لئے دو وصف بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایثار اور تواضع اور بدقسمتی سے یہی دو وصف قوم میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں اور اس سے بڑی بدقسمتی یہ کہ انکی جگہ خود غرضی اور تکبر کی عملداری ہے۔ اور یہ دونوں مفاسد بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ اس سے آگے شاید کسی درجے کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ نمود پرستی، جاہ طلبی، خود پسندی اور دوسروں کی تحقیر تو گویا مقصد حیات بن چکے ہیں۔ جہاں اپنی ذات کے تحفظ کا جنون اور اپنی بات منوانے کا

خبط سوار ہو وہاں اتحاد کی باتوں سے دل بہلایا جا سکتا ہے مگر عملاً اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل وطن ان دو مہلک بیماریوں کا احساس پیدا کریں اور ان سے نجات پانے کی فکر کریں۔ دوسری طرف ایثار اور تواضع کا وصف پیدا کرنے کی کوشش کریں ورنہ اتحاد کی صرف باتیں خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ اتحاد بجائے خود مقصد نہیں بلکہ مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اتحاد اگر مطلوب و مقصود ہو تو چوروں اور ڈاکوؤں کا اتحاد کیوں معیوب ہو۔ راہزنوں کا اتحاد اتنا نقصان دہ نہیں جتنا سیاسی لیڈروں کا اتحاد دور رس تباہی کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے اتحاد پر زور دینے کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا جائے کہ اتحاد ہو، حق کے ثبات کے لئے ہو دین کی برتری کے لئے۔ اتحاد کے ایک عظیم داعی نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

ایک ہوں مسلم، حرم کی پاسبانی کے لئے

ظاہر ہے کہ محض "ایک ہونا" مقصود نہیں، بلکہ "حرم کی پاسبانی کے لئے" ایک ہونا مطلوب ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

مدیر

باتیں انکی ـــــ خوشبو خوشبو

ملفوظات حضرت شیخ المکرم مدظلہ

● - دنیا میں مطیع اور مطاع کا سلسلہ ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور غالباً ہمیشہ جاری رہے گا۔

● - اطاعت کے اعتبار سے تین صورتیں پائی جاتی ہیں اوّل مطلق اطاعت، دوم مطلق نافرمانی، سوم من وجہ اطاعت اور من وجہ نافرمانی۔

● - مطلق اطاعت دراصل غیر مشروط اطاعت ہے اس کا تعلق کی صورت یہ ہے کہ مطاع اللہ اور اس کا رسولؐ ہے اور مطیع اللہ کا بندہ اور اس کے رسولؐ کا اُمتی ہے۔ اس اطاعت میں بندہ اپنے اختیار سے کلیتہً دست بردار ہو جاتا ہے ارشاد باری ہے: ما کان لمومن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم یعنی جب اللہ اور اس کے رسول کا حکم آجائے یا کسی امر میں وہ فیصلہ سُنا دیں تو کسی مومن مرد یا عورت کو اس میں چون وچرا کرنے کا اختیار نہیں رہتا" اس اس اطاعت کا اصطلاحی نام ایمان ہے اور ایسے مطیع کو مومن کہتے ہیں۔

● - مطلق نافرمانی - اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جب مطلق نافرمانی کا پایا جانا بھی ممکن ہے تو مطیع اور مطاع کا سلسلہ ہمہ گیر نہ ہوا بلکہ اس میں استثنا پایا جاتا ہے یعنی ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو کسی کے مطیع نہ ہوں مطلق نافرمانی سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے ایمان اور اطاعت کے تعلق کے منکر ہوں۔ یعنی وہ اللہ اور اس کے رسول کے مطیع نہیں اور ان کے بغیر وہ سب کے مطیع ہوتے ہیں۔ ایسے نافرمان کو اصطلاح شریعت میں کافر کہتے ہیں۔

● - من وجہ اطاعت اور من وجہ نافرمانی:-

یہ صورت لوگوں کے باہمی تعلق کا بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی حاکم، استاد، بزرگ شیخ وغیرہ ایسا حکم دے جو اللہ و رسولؐ کے احکام کے خلاف نہ ہو تو اس کی اطاعت کی جائے اور اگر اس کے برعکس حکم دے تو اطاعت نہ کی جائے اس طرح اس اطاعت کی حیثیت ایک لحاظ سے مطلق اطاعت کی ہوئی ایک لحاظ سے مطلق نافرمانی کی ہوئی یعنی اللہ و رسولؐ کے حکم کی مطلق اطاعت ہوگی اور اللہ و رسول کے مخالف حکم کی مطلق نافرمانی ہوئی

● - اللہ کی اطاعت کے لئے اللہ پر ایمان لازمی ہے اللہ پر ایمان کی صورت جو عنداللہ مقبول ہے صرف وہ ہے جو اللہ کا رسول بتائے۔ لہٰذا جب تک اللہ کے رسول پر ایمان اور

اعتماد نہ ہو اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت نہیں ہو سکتی گویا ایمان باللہ فرع ہے ایمان بالرسالت کی۔

● ۔ اللہ تعالےٰ نے تشریعی اطاعت کا نظام قائم رکھنے کے لیے اپنے احکام ایک کامل اور آخری کتاب یعنی قرآن حکیم کی صورت میں نازل فرمائے۔ مگر یہ بات کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اس کے احکام کا مجموعہ ہے اللہ کے رسولؐ نے بتائی۔ اللہ کے رسولؐ کی بات کو اصطلاح میں حدیث کہتے ہیں تو معلوم ہوا کہ رسولؐ کی بات پر ایمان نہ ہو تو اللہ کی کتاب پر ایمان نہ ہو تو اللہ کی کتاب پر ایمان نہیں ہو سکتا نتیجہ یہ ہوا کہ ایمان بالقرآن فرع ہے ایمان بالحدیث کی۔

● ۔ نظام اطاعت کی کڑیوں میں ترتیب یہ ہوئی کہ رسول پر ایمان لاؤ، رسول کی بات پر ایمان لاؤ تو رسول کی اطاعت ہو سکے گی اور رسول کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے رسول پر ایمان نہیں رسول کی بات پر ایمان نہیں تو اللہ پر ایمان ہو سکتا ہے نہ اللہ کے کلام پر ایمان ہو سکتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث رسول کا انکار دراصل قرآن کا انکار ہے خواہ آدمی زبان سے لاکھ تمسک بالقرآن کا ڈھنڈورہ پیٹے۔

● ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اعلان کیا میں اللہ کا آخری رسول ہوں۔ یہ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے یہ مجھ پر نازل ہوئی ہے میری شریعت آخری شریعت ہے۔ یہ ساری بات رسول کی بات ہے یہی حدیث رسول ہے جس نے اس بات کو مانا انہوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب کس سند پر تسلیم کیا۔ ثابت ہوا کہ جس نے رسول کی حدیث کو تسلیم نہیں کیا اس نے اللہ کی کتاب کو مطلق تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ اس کا ایمان باللہ کا دعویٰ بھی قابل تسلیم نہیں۔ کیونکہ ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو رسول کی دی ہوئی تفصیل کے مطابق ہو۔ اور یہ تفصیل حدیث رسول سے ہی معلوم ہو سکتی ہے جب حدیث کا انکار ہے تو قرآن کا اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ محض خود فریبی ہے۔

● ۔ اپنے خیال کے مطابق تو کافر بھی اللہ کو مانتے تھے مگر ان کا اپنی پسند کا ایمان باللہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں تھا۔ بلکہ ان سے مطالبہ یہی تھا کہ اللہ پر اس طرح ایمان لاؤ جیسے اللہ رسول کہتا ہے۔ جب تم حدیث رسول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو اللہ پر تمہارا دعویٰ ایمان جھوٹا ہے۔

● ۔ اللہ کے رسول نے لوگوں کو کفر کے ڈنڈے سے نکالنے اور اسلام کے دائرے میں داخل کرنے کے لیے سب سے پہلے اور ہمیشہ کے لیے دو اقرار کرائے اور ان الفاظ سے کرائے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس حدیث رسول کے مطابق ہمیشہ کے لیے یہ اصول بن گیا کہ ان لفظوں کے ذریعہ یہ اقرار کرنے سے آدمی اسلام کے دائرے میں آجاتا ہے اگر کوئی کافر لا خالق الا اللہ محمد رسول اللہ یا لا رزاق الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ دے تو وہ اسلام کے دائرے میں داخل نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ اس نے رسول کی بات اور رسول کے طریقے کو چھوڑ کر اپنا ایک نیا طریقہ وضع کر لیا ہے گو حقیقت کے اعتبار سے وہ بات ٹھیک ہے مگر رسول کے طریقے کے مطابق نہیں لہٰذا مقبول نہیں۔

● ۔ قرب الٰہی اطاعت الٰہی سے حاصل ہوتا ہے اور اطاعت الٰہی، اطاعت رسول کے بغیر اطاعت الٰہی نہیں ہو سکتی اسی طرح قرب رسول کے بغیر قرب الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسرار التنزیل

مولانا محمد اکرم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

ولما ورد ماء مدین - الیٰ - ان خیر من استاجرت القوی الامین ﴿سورہ قصص آیات ۲۲ تا ۲۶﴾

"اور جب پہنچا مدین کے پانی پر۔ پائے وہاں جمع ہو رہے لوگ پانی پلاتے، اور پائی ان کے سوا دو عورتیں روکے کھڑیں۔ بولا تم کو کیا کام ہے۔ بولیں ہم نہیں پلاتی پانی جب تک پھیرے جاویں چرواہے اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا پھر اس نے پلا دئے اُن کے جانور پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف بولا اے رب تو جو اُتارے میری طرف اچھی چیز میں اس کا محتاج ہوں پھر آئی اس کے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی شرم سے بولی میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے، کہ بدلے میں دے حق اس کا کہ تو نے پلا دئے ہمارے جانور۔ پھر جب پہنچا اس کے پاس اور بیان کیا اس سے احوال کہا مت ڈر بچ آیا تو اس قوم ناانصاف سے بولی ان دونوں میں سے ایک اے باپ اس کو نوکر رکھ لے بہتر نوکر جو تو رکھا چاہتا ہے وہ جو زور آور ہو امانتدار" (ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ قصص کی یہ آیات جو بظاہر ایک واقع کو بیان فرماتی ہیں اپنے اندر تربیت اخلاق کا ایک سمندر رکھتی ہیں جس میں سے خصوصاً ایک ایسا مقام بیان کرنا چاہتا ہوں جسے اچھی چیز یا خیر کہا گیا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب موسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم سے بچ کر یا بھاگ کر کسی پناہ کی تلاش میں نکلے جبکہ نہ تو کوئی معین منزل تھی نہ اہتمام سفر کر تیاری کر کے چلے ہوں بلکہ اچانک اطلاع ملنے پر بھاگ نکلے تو یہاں یہ بات کچھ سمجھ آتی ہے کہ ہر معاشرہ اپنی ایک خاص روش رکھتا ہے اور اپنے افراد پر ایک خاص رنگ چڑھاتا چلا جاتا ہے اگر اس کے مزاج کے خلاف کوئی فرد پایا جائے تو اس کی تین صورتیں ہیں کہ وہ اس کا رنگ قبول کرے ورنہ قتل ہوگا اور یا اس معاشرے کو چھوڑ دے۔ یہ حال صرف کافر اور بدکار معاشرے کا نہیں بلکہ واقعی نیک معاشرہ بھی یہی کچھ چاہتا ہے اور اس میں اس کے مزاج کے خلاف افراد کا یہی حال ہوتا ہے اس لیے جو لوگ واقعی نیکی اپنانا اور پاک زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انہیں پاکیزہ ماحول بھی اپنانا ہوگا جو یقیناً بدکاروں کی محافل میں میسر نہیں آسکتا اور ان میں سے جو بُری مجالس کو برداشت کرتے یا پسند بھی کسی حد تک کر لیتے ہیں ان میں یقیناً کوئی بات

ایسی ہے جو ان مجالس کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے یہ بہت توجہ طلب امر ہے آسانی سے نظر آنے والی شے نہیں تو یقیناً بھلائی کے طلبگاروں کو بھلے لوگوں کی ہم نشینی بھی درکار ہوگی کہ کلیمی کے لئے صحبتِ شعیبؑ بھی ضروری ہے۔ بہرحال جب خستہ تن پریشانِ حال اور منزل سے ناآشنا مسافر مدین کے چشمہ پر پہنچا تو چرواہوں کو دیکھا کہ اپنے ریوڑوں کو پانی پلا رہے ہیں، ڈول پہ ڈول کھینچ رہا ہے جوان بوڑھا اور بچے جمع ہیں جہاں یہ سب کچھ ہے وہاں دو جوان بچیاں ایک طرف ہٹ کر اپنے ریوڑ کو روکے کھڑی ہیں یہاں انہیں متوجہ کرنے کے لئے یہ بات کافی تھی کہ ان دونوں کے سوا اس بھیڑ میں کوئی عورت بھی نہیں اور یہ دو جو ہیں یہ بھی بالکل الگ کھڑی ہیں یعنی مرد کے ساتھ بے محابہ ملکر کام کرنا عورت کو زیبا نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عورت و مرد کے کام اپنے اپنے ہیں نان نفقہ کا اہتمام مرد کا حق ہے اور گھر کو سنوارنا بچوں کی نگہداشت و تربیت، بزرگوں کی خدمت یہ عورت کا کام ہے۔ لیکن بالکل اسی طرح جیسے کسی گھر میں عورت نہ ہو تو مرد خود ہانڈی روٹی پکاتا ہے جہاں کوئی مرد کام کرنے کو نہ ہو اور وہ کام ضروری ہو تو عورت بھی کر سکتی ہے مگر اس ضرورت کو مردوں کے ساتھ بے تکلفی کا زینہ نہیں بنا سکتی، جیسے یہاں جن کے مرد کام کرنے والے ہیں وہ کوئی عورت اس وقت نہیں آئی جب مرد پانی پلا رہے ہیں۔ مگر ایک گھر ایسا بھی ہے جو بستی کا رہنما و پیشوا بھی ہے معزز و محترم بھی ہے، اللہ کا نبی ہے یہاں حاضری سے خود معذور ہے بڑھاپے نے بے بس کر دیا ہے خادم فی الوقت موجود نہیں جوان بیٹیاں ہیں دو۔ دونوں کو ریوڑ کے ساتھ پانی پلانے بھیجا ہے تو یقیناً چرانے بھی گئی ہوں گی مگر یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ عورت کی حیا اور عصمت کی حفاظت کا خصوصی اہتمام ہے کہ ایک بھی تو جا سکتی تھی مگر دونوں کو بھیجا کہ اکیلے پن کی نسبت دو کا ہونا ہر دو کے لئے حفاظت کا سبب ہے پھر چراگاہ تو ہمیشہ وسیع ہوتی ہے پانی کا ایک ہی چشمہ ہے مگر یہاں بھی مردوں کی بھیڑ میں گھسنا ان کو زیب نہیں دیتا بلکہ الگ کھڑی ہیں تو حیرت سے پوچھا آپ کیوں ایک طرف کھڑی ہیں ما خطبکما تم دونوں کو کیا حاجت اور کونسا کام یہاں لایا ہے کہ بلا ضرورت یا مجبوری عورت کا مردوں کے ہجوم میں کیا کام تو کہنے لگیں کام تو یہی ہے جو کر رہے ہے ریوڑ ہی کو پانی پلانا ہے مگر جب تک تمام چرواہے فارغ نہ ہو لیں ہم نہیں پلا سکتے یہ فارغ ہوں گے یہاں سے چلے جائیں گے تو ہم بھی پلا لیں گی اب رہی یہ بات کہ اگر اتنا ہی اہتمام مطلوب ہے تو پھر کسی مرد کو بھیج دیا ہوتا تو کہا کہ ہمارے گھر یہ صرف ایک والد کی ذات گرامی ہے جو بڑھاپے کے جوبن کا شکار ہے، "شیخ" "کبیر" سو یہ مجبوری ہمیں باہر تو نکال لائی مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم بے تکلف مردوں میں گھس پڑیں کہ تمام ضروریات سے عورت کے حیا اور اس کی عفت و عصمت کی حفاظت ضروری ہے آپ کے غزوات نبوی صلعم میں بھی عورتیں تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی نظر آئیں گی لیکن زخمیوں یا پیاسوں سے بے تکلفی کرتی نظر نہ آسکیں گی۔

آج کل عورت کو مرد کے مساوی لانے کا بڑا ڈھنڈورہ پیٹا جا رہا ہے اور یہ حق بھی ہے کہ عورت بھی معاشرہ کا ایک نازک اور حساس فرد ہے نہایت اہم ستون ہے بے شک ایک پہیہ ہے اور اسے دوسرے کے برابر چلنا چاہیئے۔ مگر یہ مساوات

الیسی ہو کہ جیسے مرد مردوں والے کام کرنے کی سہولت رکھتا ہے ایسے ہی عورت، عورتوں والے کاموں کو کرنے کی سہولت رکھتی ہو۔ پڑھنے کی سہولت ہو مگر یہ نہ ہو کہ جوان بچیاں لڑکے لڑکوں کی محافل کی زینت ہوں یہ نہ ہو کہ تنہائی میں پروفیسر کے کمرے میں پڑھ رہی ہو، ڈاکٹر تو بن سکتی ہے مگر ڈاکٹری کے حصول میں اپنے فطری حیا کو نہیں دے سکتی یہ دنیا کی سب سے قیمتی دولت ہے جو اللہ نے اسے دی اور اگر اسے کھو بیٹھی تو وہ ہر وہ کام کر سکے گی جو مرد کر سکتا ہے مگر عورت نہ رہے گی، تو عورت کا عورت رہنا سب سے زیادہ ضروری ہے آپ دیکھیں کہ اسے دوسرا پہیہ کہہ کر پہلے پہیے کی لائن پر چلانے کی کوشش ہوتی ہے یہ کتنی احمقانہ کوشش ہے کہ چلانے کے شوق میں گاڑی کی تباہی کا سامان کیا جا رہا ہے، میرے بھائی پہلے پہیے کو اپنی لائن پر چلنا ہے اور دوسرے کو اس کے متوازی دوسری لائن پر دونوں کی اپنی اپنی راہ ہے ہاں برابر چلنے کا حق دونوں رکھتے ہیں اسی طرح مردوں کو اپنے حقوق کی آزادی ہے اور عورت کو اپنے حقوق حاصل کرنے چاہئیں نہ یہ کہ نکل کر میدان میں دوسرے اور کفار کی پیروی میں محفلوں کی زینت بننے پر فخر کرے۔

کبھی دونوں پہیے مل سکے ہیں اُن کی سمت ایک ہو چلنے کا انداز ایک ہو رفتار ایک ہو مگر درمیانی فاصلہ بھی تو قائم رہے اگر ذرا ٹیڑھا پن آیا تو تباہی لائے گا چہ جائیکہ ایک پہیہ سرے سے اپنی جگہ چھوڑ کر دوسرے چاہیں اس سے جا کر مل جائے تو اس طرح سے گاڑی کون سنبھالے گا۔ سو یہاں سے خود عورتوں کو اپنا طریق کار جان لینا چاہیے اس تہذیب مغرب نے صرف ایک رُخ پر سجھا کر عورتوں کو عورت کی صف سے خارج کر دیا ہے تو دوسری طرف ہندو مت وغیرہ نے اسے بالکل انسانی حقوق سے بھی محروم رکھا ہے یہ اسلام ہے جس نے اعتدال کی راہ دکھائی اور عورت کی عظمت کو معاشرے سے منوایا اسے ہر طرح کے مظالم سے نجات دلا کر ایک خاص مقام بخشا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کی عصمت اس کی عزت اور اس کی حیا کی حفاظت کو بھی لازمی و ضروری رکھا جو انسانیت کا اصل زیور ہے اور دنیا کے تمام کمالات حاصل کرنے کا حق رکھتی ہے مگر عورت رہ کر ان کمالات کے حصول کو نسوانیت کے ضیاع کا سبب نہیں بنا سکتی چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ریوڑ کو سیراب کر دیا اور وہ فارغ ہو کر چلی گئیں تو یہ سائے میں جا بیٹھے اب اگر عورت اس امتزاج کو قائم رکھے تو اس کی عزت اور اللہ کے نزدیک اس کی عظمت کا اندازہ کریں کہ اللہ کا ایک محبوب خدا کا کلیم، اللہ کا نبی اور رسول سخت پریشانی کی حالت میں ہے، دوست احباب سے دور زاد راہ سے خالی لباس خستہ جسم تھکاوٹ سے چور کئی روز کا بھوکا پیاسا پھر فرعونی لشکر کے تعاقب کا فکر اور منزل و راہ کی عدم واقفیت ذرا آپ یہ سارا نقشہ اپنے ذہن میں بنائیں اور پھر اس کی آرزو سنیں کہ اپنے رب سے کیا مانگ رہا ہے۔ کہ انسان کو مانگنے کے لئے صرف وہی دروازہ چاہیئے دینے والا ہی ایک ہے باقی تو ساری کائنات خود اس کی بارگاہ سے مانگنے والی ہے۔ سو عرض کیا اے پروردگار انی بما انزلت الی من خیر فقیر۔ اے اللہ جو بہترین شے تو مجھے عطا کرے میں اس وقت اس کی سخت احتیاج رکھتا ہوں، اور نہ گھر نہ دوست نہ مال نہ منزل کوئی ایسی شے عطا کر جو سب کا نعم البدل ہو، جو دوست بھی ہو گھر بھی ہو ہم سفر بھی ہو اور منزل بھی قرآن پاک نے خبر فرمایا ہے اور

شاہ صاحب نے ترجمہ کیا ہے اچھی چیز اور اس اچھی چیز کا ہمیں بھی شوقِ دیدار ہے کہ جس پہ پردہ کیا ہے تو جواباً کیا ہوا ان دونوں میں سے ایک لڑکی موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی جو اپنے چلنے اور رفتار میں بھی حیا رکھتی تھی۔ کسی سے ملنا یا بات کرنا تو دوسری شے اکیلی چلی آ رہی ہے مگر چال سے حیا ٹپک رہی ہے وہی حیا جو اسلام عورت کو عطا کرتا ہے اور وہی حیا جو تہذیبِ مغرب نے عورت سے چھین لی ہے اور اسے ایک جسدِ بے روح بنا دیا ہے۔ جس کا آنا وصالِ شعیبؑ کا سبب بنا جو منزل پہ لے جانے کو آئی اور جس نے آکر دنیا کا سارا آرام دے دیا جو زخمی دل پہ سکون کی مرہم رکھنے والی تھی اور جو اللہ نے اپنے کلیم کی دعا کے جواب میں بھیجی جو خیر تھی جو اچھی چیز تھی مگر کاش کوئی اس کے اوصاف کو بھی دیکھے جنہوں نے اسے خیر بنا دیا تھا سراپا خیر مجسم خیر مجسم نیکی ایک ایسی نیکی جس کے میزانِ عدل میں تولا جا سکے جو روزِ حشر اعمالِ حسنہ کے ساتھ وزن کی جا سکے جو اللہ کی بارگاہ میں پہنچانے والی ہو جس کے ہاتھ سے پاک اور طیب غذا نصیب ہو جس کی گود سے صدیق و فاروق پیدا ہوں جس کی اداؤں میں حیا ہو اور جس کی حرکات میں یادِ خدا ہو جس کا حسن اس کے اعمال پہ ضو فگن ہو اور جس کا تبسم معاشرے کو ٹھنڈی چاندنی فراہم ہو جس کا دودھ پی کر غازی پل رہے ہوں۔ اور جس کے خانگی ماحول میں بچے درسِ جہانگیری و جہاں آرائی حاصل کر رہے ہوں اس کا نام اس وجود کا نام اس سراپا برکت کا نام عورت ہے اور اس کے عورت پن کا مدار اس کی حیا پر ہے اگر اس سے حیا چھین گئی تو سب کچھ الٹ جائے گا اس کے بچے ایکٹر تو بنیں گے عملی انسان نہ ہوں گے استادے تو ہوں گے مگر

عالمی دنیا کے۔ جو سکون کی جگہ دل کو دکھ دے گی جس کے ہاتھ سے حلال روزی بھی ناپاک غذا بن جائے گی اور جو روزِ حشر برائی کی طرف گروزنی کرے گی جو سراپا شر بن جائے گی کہ خیر کا نقشہ تو موجود اب اس کے خلاف اس کی ضد ہی ہوگی اور جب یہ شر کا روپ اختیار کرے گی تو یاد رکھو ایک عورت چار چار مردوں کو لے کر جہنم میں جائے گی اول باپ پھر بھائی پھر خاوند اور سب سے آخر اولاد جو اس کی حفاظت کے اور تربیت کے ذمہ دار تھے جنہوں نے اس کو گرنے سے بچانے کی کوشش نہ کی جو اگر چاہتے تو اسے بے حیائی کی دلدل میں گرنے سے بچا لیتے یا اگر گر چکی تھی تو پھر نکال لیتے۔ اب دیکھو عورت کی حیا اور اس کی اللہ کے نزدیک قدر و منزلت جب یہ موسیٰ علیہ السلام کو لے کر والد ماجد کے پاس پہنچیں تو پھر سفارش بھی کی کہ ابا جی آپ کو خادم کی ضرورت تو ہے ہی آپ اسی شخص کو رکھ لیں اور کیوں رکھ لیں کہ یہ ایک تندرست و توانا اور قوی جوان ہے جو کام کر سکتا ہے کہ خدمت کے لیے مریضوں کو تو بھرتی نہیں کیا جاتا مگر صرف طاقت و جوانی بھی کوئی کمال نہیں یہ امین بھی ہے کہ اس نے ہمارے ریوڑ کو پانی تو پلایا مگر اس کی نگاہ نے خیانت نہ کی جھکی رہی اس کی زبان نے ضرورت کی حد سے نکل کر خیانت کرنے کی جرأت نہ کی اس کی رفتار نے اس کی امانت پہ گواہی دی ایسا آدمی ضائع نہ کرنا چاہیے اور اسے کھو نہ دینا چاہیے یہی وہ خصوصیت ہے جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے یہ وہی وصف ہے جو بدترین دشمن مشرکینِ مکہ بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم میں تسلیم کرتے تھے

اے اللہ ہمارے مردوں کو صدق و امانت اور ہماری عورتوں کو حیا کی دولت عطا کر آمین ثم آمین۔

حافظ عبدالرزاق

چراغِ مصطفویؐ

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یأخذ عن ھؤلاء الکلمات فیعمل بھن او یعلم من یعمل بھن قلت انا یا رسول اللہ فاخذ بیدی فعد خمسا فقال اتق المحارم تکن اعبد الناس

ارض بما قسم اللہ لک تکن اغنی الناس

واحسن الی جارک تکن مومنا

واحب للناس ما تحب لنفسک تکن مسلما

ولا تکثر الضحک فان کثرۃ الضحک تمیت القلب (مشکوۃ - رواہ احمد والترمذی) (کتاب الرقاق)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کون ہے جو مجھ سے چند باتیں (جو میں کہنے والا ہوں) سیکھے اور ان پر عمل کرے یا کسی اور کو سکھائے جو ان پر عمل کرے، میں نے کہا یا رسول اللہ میں سیکھتا ہوں چنانچہ حضور اکرمؐ نے میرا ہاتھ پکڑا اور گن کر پانچ باتیں ارشاد فرمائیں:-

۱- شارع نے جو باتیں حرام قرار دی ہیں ان سے بچ - تو سب سے زیادہ عبادت گذار بن جائے گا۔

۲- جو کچھ اللہ تعالےٰ نے تجھے دیا ہے اس پر مطمئن ہو جا - تو سب سے بڑا غنی ہوگا۔

۳- اپنے پڑوسی کے ساتھ بھلائی کر کامل مومن بن جائے گا۔

۴- دوسروں کے لئے وہی پسند کر جو اپنے لئے پسند کرتا ہے تیرا اسلام کامل ہو جائے گا۔

۵- کثرت سے ہنسنا چھوڑ دے کیونکہ اس سے دل مرجاتا ہے۔

اس مختصر سی حدیث میں حضور اکرمؐ نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعدد گوشوں کے لئے رہنما اصول بیان فرما دئے ہیں - جتنا غور کریں معانی کے خزانے سامنے آتے ہیں غالبؔ نے محض کہنے کو جو بات کہی تھی وہ حقیقتؔ یہاں صادق آتی ہے کہ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

کوئی حدیث اٹھا کر دیکھئے حضور اکرمؐ کے ہر لفظ میں معنی کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔

اس حدیث میں پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ اصول تعلیم و تربیت کا بنیادی اصول ہے کہ زیر تعلیم اور زیر تربیت طلبہ میں حصول علم کا شوق ابھارا جائے تاکہ جو کچھ سیکھیں اس سے کما حقہ، فائدہ اٹھائیں - چنانچہ حضور اکرمؐ نے جو انداز اختیار کیا اس میں یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے کہ کون ہے

جو مجھ سے یہ باتیں سیکھے۔"

۲۔ دوسری چیز یہ سامنے آتی ہے سیکھنے سکھانے کا عمل اس وقت پائیدار بنیادوں پر قائم ہوتا ہے جب سیکھنے والوں کے ذہن و قلب میں استاد پر اتنا کامل اعتماد ہو کہ کہ اس کی زبان سے جو نکلتا ہے حق اور مفید ہی ہوتا ہے چنانچہ حضور اکرمؐ نے اپنے صحابہ کی تربیت اس انداز سے کی تھی کہ ان کو حضور اکرمؐ پر اتنا کامل اعتماد تھا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ حدیث کی تمہید سے ظاہر ہے کہ حضور اکرمؐ نے ابھی وہ باتیں بیان نہیں فرمائیں مگر ایک شاگرد رشید جھٹ بول اٹھتا ہے میں سیکھونگا۔ اس سے بحث نہیں کہ کیا سکھائیں گے۔ بلکہ یہ خیال تک نہیں آتا خدا جانے کیا سکھائیں گے۔

۳۔ پھر سیکھنے کی غرض بتائی کہ سیکھ کر اس پر عمل کرے تو معلوم ہوا کہ علم فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ مقصود عمل ہے اور علم اس مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اگر علم پر عمل نہ ہو تو وہ علم صرف بیکار ہی نہیں عالم پر وبال ہے ؏

"علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است"

سوچئے ایک آدمی جانتا ہے کہ سنکھیا زہر ہے اور زہر کھانے سے آدمی مر جاتا ہے اس علم کے باوجود اگر وہ سنکھیا سے بچتا نہیں بلکہ شوق سے کھا جاتا ہے تو بتلائیے اس علم نے اسے کیا فائدہ پہنچایا۔ لہذا حضور اکرمؐ نے شروع میں مقصد اور ذریعہ کی نشاندہی فرما دی کہ محض سیکھنا اور علم حاصل کرنا مقصود نہیں بلکہ اس نیت سے سیکھنا چاہئیے کہ عملی زندگی میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

ایک اللہ کے بندے نے اپنے زمانے کے کسی مشہور فلاسفر کے متعلق فرمایا کہ وہ اخلاق سے عاری ہے۔ اس نے سنا تو اخلاق پر ایک تحقیقی کتاب لکھ دی اور ان کو بھیج کر بتایا کہ تمہاری بات میں کوئی وزن نہیں کتاب دیکھ لو۔ آپ نے جواب میں فرمایا میں نے کب کہا تھا کہ وہ اخلاق کا علم نہیں رکھتا میں نے تو کہا تھا کہ اس کی عملی زندگی اخلاق کے فقدان کی آئینہ دار ہے معلوم ہوا۔ صرف جان لینا کافی نہیں بلکہ جاننا عمل میں لانے کے لئے ہونا چاہئیے بقول اکبر

ے مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاق سند
خوب کہنا اور ہے، اور خوب ہونا اور ہے

۴۔ سیکھنے والا خود اگر کسی مجبوری کی وجہ سے عمل نہ کر سکے تو وہ علم ایسے لوگوں کو سکھائے جو اس پر عمل کریں۔

اس شق میں کئی نکات ہیں مثلاً ممکن ہے سیکھنے والے نے سیکھ تو لیا مگر کوئی ذہنی جسمانی یا ماحول کے نامساعد ہونے کی وجہ سے وہ اپنے علم پر کامل طور پر عمل نہیں کر سکتا تو کیا وہ اسے بھلا دے یا حرف غلط کی طرح ذہن سے محو کر دے نہیں بلکہ یہ علم تو اس کے پاس امانت ہے جو اس کا اہل دیکھے اس تک پہنچائے۔ اہل کون ہے جو علم پر عمل کرنے کی نیت سے سیکھے اور سیکھ کر فی الواقع اس پر عمل کرے۔

اس سلسلے میں ایک بات قابل غور ہے۔ بالعموم کہا جاتا ہے کہ

لم تقولون ما لا تفعلون کا مطلب یہ ہے کہ جب تم خود عمل نہیں کرتے تو دوسروں کو کیوں عمل کی تلقین کرتے ہو۔ مگر اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سیکھ کر خود عمل نہ کر سکے تو ایسے لوگوں کو سکھائے جو اس پر عمل کریں۔ یہ بات تو آیت

کے مخالف ہوئی تو اس کا جواب مختصراً دیا ہے جو مولانا تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں دعویٰ کی نفی ہے دعوت کی نفی نہیں۔ پس آیت اور حدیث میں کوئی تعارض نہ رہا۔

۵۔ پھر سکھانے کا انداز ملاحظہ ہو کہ سراپا ذوق طالب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور گن گن کے ایک ایک بات بتانا شروع کر دیا جس سے ایک تو شفقت ٹپکتی ہے۔ دوسرا ان باتوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ یہ باتیں ایسی نہیں کہ آدمی سرسری طور پر سُنے اور سُنی اَن سُنی کر دے بلکہ ضرورت ہے کہ اُن کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے ساتھ وہی سلوک کرے جس کی یہ مستحق ہیں۔

۶۔ چوتھی بات یہ ہے کہ وہ اہم اُمور جانے کے ساتھ ہر ایک کام کا ثمرہ اور نتیجہ بھی بیان فرمایا یہ بالکل انسانی نفسیات کا مسئلہ ہے۔ انسان کسی کام کے نتیجہ کے متعلق گومگو کی حالت میں ہو تو پوری خوشدلی اور جذبے سے وہ کام نہیں کرتا جس کام کے نتیجے کا اسے پورا یقین ہوتا ہے اس میں اپنی ساری قوتیں لگا دیتا ہے۔

۷۔ پہلی بات فرمائی کہ حرام سے بچو۔ خواہ وہ کام ہو، یا بات ہو، یا مال ہو، کسی کام کے کرنے میں تو واقعی محنت کرنی پڑتی ہے مگر بچنے میں کونسی قربانی کرنی پڑتی ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ حرام سے بچنا سیکھ جائے گا تو عابد ترین انسان شمار ہوگا۔ اپنے روزمرہ کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ "بچنے" میں واقعی بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ آپ دیکھیں ایک شرابی دولت برباد کرتا ہے، صحت تباہ کرتا ہے، بھلے مانسوں کی نظر میں ذلیل ہوتا ہے۔ مگر شراب چھوڑتا نہیں۔ حالانکہ چھوڑنے میں دولت بھی بچتی ہے، صحت بھی اور عزت بھی۔ پھر وہ اس حرام سے کیوں نہیں بچتا۔ بس یہ محض خواہش پرستی اور لذت پرستی کا جذبہ ہے جو اسے بچنے نہیں دیتا۔

یہی حال تمام محارم یعنی حرام کاموں اور حرام باتوں کا ہے۔ خواہش پرستی، توحید کے مقابلہ میں ایک مستقل دین ہے جس کی نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ ارأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ کسی اہل نظر نے ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے تو لازماً وہ فرشتہ سے بھی افضل ہے۔ مگر عبادت میں تو انسان قطعاً فرشتوں سے بڑھ نہیں سکتا۔ عبادت سے مراد وہ عام مفہوم ہے کہ کرنے کے کام عبادت شمار ہوتے ہیں، ہاں اس کی صرف ایک صورت ہے کہ وہ محارم سے بچے۔ فرشتے اس میدان میں انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تخلیقی طور پر لا یعصون اللہ کے وصف سے متصف ہیں لہٰذا آدمی جتنا محارم سے بچتا ہے اتنا ہی وہ شرفِ انسانیت حاصل کرتا ہے۔ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ لوگ بڑے بڑے نیک کام کرتے ہیں مگر حرام مال کو شیر مادر سمجھتے ہیں اس لئے کہ لوگوں نے تقویٰ کے پیمانے خود وضع کر رکھے ہیں۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ ہر عبادت بڑے اہتمام سے کرتے ہیں مگر رشوت لیتے ہیں تو بے باکی سے غبن کرتے ہیں تو دھڑلے سے ہیرا پھیری کرتے ہیں تو بڑی سینہ زوری سے یہ تضاد اس لئے ہے کہ لوگوں نے یہ جعلی کرنسی چلا رکھی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جس کرنسی کے بدلے کچھ مل سکتا ہے وہ صرف

وہی ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر ثبت ہو محارم سے بچنے کا ثمرہ عابد ترین بن جاتا ہے اس میں کیا خوبی ہے؟ - اس میں خوبی یہ ہے کہ بندے کا اپنے رب سے جو تعلق ہے۔ اس تعلق کا احساس بنیادی خوبی ہے پھر تعلق کو مضبوط کرنا اور بڑھانا یہ انسان کا مقصد تخلیق ہے۔ پھر اس تعلق کی آخری منزل کا نام عبودیت ہے اس سے آگے مخلوق کے لئے کوئی مرتبہ نہیں تو گویا حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ محارم سے کامل طور پر بچنا مقام عبودیت تک پہنچتا ہے اور یہ انسانیت اور ایمان کے کمال کا درجہ ہے۔

دوسرے نمبر پر جس امر کی تعلیم فرمائی وہ ہے خالق کی تقسیم پر راضی ہونا۔ اور اس کا نتیجہ ہے سب سے زیادہ مطمئن اور تمام فکروں سے بے نیاز ہو جانا۔

یہ بات بالکل سادہ سی ہے مگر بعض کج اندیش ذہن اس میں کئی پیچ ڈال دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس کائنات کا جو خالق ہے وہی اس کا نظام چلا رہا ہے۔ اس نے مخلوق کی ہر نوع کو کچھ ڈیوٹی سونپی ہے اور اس ڈیوٹی کو پورا کرنے کے لئے اس کو مناسب اسباب و وسائل دے رکھے ہیں اسی طرح انسان بھی اسی کائنات کی مشین کا ایک پرزہ ہے اس کو اس کے حال کے مطابق اسباب و وسائل و ذرائع دے کر اسے ایک ڈیوٹی سونپ دی ہے۔ ہاں اس کو آزادی ہے کہ ان وسائل و ذرائع کو اپنی آزاد مرضی سے استعمال کر سکتا ہے۔ یہاں پہنچکر انسان دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک وہ جو اس رزمگاہ حیات میں اپنی تیار کردہ سکیم کے مطابق کام کرتے ہیں اور اپنے اندازے سے ایک نتیجہ متعین کر لیتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حال میں بعینہٖ اُن کی مرضی کے مطابق نتیجہ نکلے اس لئے وہ جز بز ہوتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں، گلہ، شکوہ کرتے ہیں اور کبھی خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ اس طرز زندگی کا نام اصول تجویز ہے اور اس طرز زندگی میں مرتے دم تک پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرا گروہ ہے جو اول تو خالق سے پروگرام لیتا ہے پھر خالق کی دی ہوئی صلاحیتوں کے مطابق اپنی ڈیوٹی پوری دیانت داری سے ادا کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی نتیجہ خالق پر چھوڑتا ہے، کیونکہ یہ انسان کے دائرہ کار سے خارج ہے جب یہ انسان کا کام ہی نہیں تو اس کی فکر کیوں کرے پھر اس کے ساتھ ہی اسے یقین ہوتا ہے کہ خالق کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا پھر یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ خالق کے ہاں صلہ دینے کی صورتیں مختلف ہیں اور صلہ کی صورت کا تعین خالق اپنی حکمت کے مطابق کرتا ہے لہٰذا اس کا ہر فیصلہ صحیح ہوتا ہے خواہ میری سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس طرز زندگی کا نام اصول تفویض ہے اور اس کا نتیجہ کامل اطمینان اور ہر قسم کے فکر و غم سے آزادی ہے اور اسی کا نام غنا یعنی غنی ہونا ہے۔ ورنہ کروڑوں اور اربوں میں کھیلنے والے تو بیچارے خواب آور گولیاں کھائے بغیر رات کو سو بھی نہیں سکتے۔ لہٰذا فرمایا کہ اطمینان کی زندگی چاہتے ہو تو اللہ کے فیصلوں پر مطمئن رہو۔

۹۔ تیسری بات جس کی تعلیم دی گئی وہ ہے پڑوسی سے حسن سلوک اور اس کا نتیجہ ایمان کا کامل ہونا۔ اچھوں سے اچھا سلوک تو کرتے آئے ہیں اور یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں البتہ بُروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بڑا مشکل کام ہے

اور مجاہدے کا مفہوم اسی وقت نکھر کے سامنے آتا ہے جب کوئی مشکل کام پیش ہو۔ یہاں صورت یہ ہوئی کہ پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے مگر پڑوسی ہے ایک بلائے بے درماں یا پیرِ تسمہ پا۔ یہی تو مومن کا امتحان ہے۔ امتحان میں کامیاب تب ہے جب اللہ و رسول پر یقین اور ان کی محبت کا نشہ اس حد تک مست کر دے کہ پڑوسی کی بدتمیزیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور زبانِ حال سے کہہ دے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدرت را می شناسم

۱۰۔ چوتھی بات یہ سکھائی کہ لوگوں کے لئے وہی پسند کر جو اپنے لئے پسند ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ خود سپردگی کے وصف میں کمال پیدا ہوگا۔

معاشرے میں جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اس کی بنیادی وجہ خود غرضی اور مطلب پرستی ہوتی ہے اسی بنا پر ہمارے باہمی معاملات میں یہ اصول کارفرما ہوتا ہے کہ لینے کے باٹ اور۔ دینے کے باٹ اور۔

یہیں سے ظلم کی ابتدا ہوتی ہے اسی سے باہمی نفرت پھیلتی ہے اور اسی سے امن و سکون اٹھ جاتا ہے حضور اکرمؐ نے کتنا آسان نسخہ ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی سے کوئی سلوک کرنے لگو اپنے آپ کو اس کے مقام پر رکھ کے دیکھ لو۔ یعنی یہ سوچو کہ اگر کوئی شخص میرے ساتھ یہ سلوک کرے تو کیا مجھے خوشی ہوگی۔ اگر ایسا نہیں تو مجھے اس اقدام سے باز آجانا چاہیئے۔ اس اصول کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پھیلا کر دیکھ لیجئے۔ ایک رشوت خور اہل کار اگر یہ اصول اپنائے تو کیا وہ رشوت لے سکتا ہے، ایک ڈاکو اور چور اپنے آپ کو اس مقام پر رکھ کر دیکھے جن کو وہ لوٹ رہا ہے تو کیا وہ چوری یا ڈاکہ کر سکتا ہے۔ ایک غلط فیصلہ لکھنے والا جج یا مجسٹریٹ اپنے آپ پر یہ اصول لاگو کرے تو کیا وہ ظلم کر سکتا ہے غرض کوئی مزدور ہو۔ کارخندار ہو۔ سیاست دان ہو، ملازم پیشہ ہو، تاجر ہو، زمیندار ہو اگر صرف اس ایک اصول کو پلے باندھ لے اور عملی زندگی میں اسے اپنائے تو

ERADICATION OF SOCIAL EVILS

کا محکمہ خود بخود ختم ہو جائے۔

۱۱۔ پانچویں چیز جس کی تعلیم دی ہنسی کی کثرت سے پرہیز ہے اور ایسا کرنے ... دل ... رہا ہے یہاں یہ فرق ملاحظہ ہو کہ پہلی چار باتوں میں ان کا ثمرہ بیان کرتے وقت مثبت پہلو بیان فرمایا اور اس کا فائدہ بتایا۔ یہاں منفی پہلو سامنے رکھ کر اس کا نقصان بتایا جا رہا ہے مگر اس نقصان کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جسے دل زندہ کی دولت کا اندازہ ہو۔ اس اندازے کے لئے تو ایک وصف چاہیئے بقول اقبال

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہبازِ نہیں

دل کیا ہے؟ محبت کا مقام اور محل اور دل کی زندگی کیا ہے؟

دل کا محبت سے سرشار ہونا، اور محبت تو سراپا درد ہے سوز ہے، اطاعت ہے، بھلا ہنسی اور کثرت سے ہنسی

کا اس سے کیا جوڑ۔

دل کی زندگی اور موت کا فلسفہ حضور اکرم ؐ نے خود بیان فرما دیا۔

مثل الذی یذکر ربہ والذی لا یذکر ربہ لمثل الحی والمیت او کما قال ؐ

"یعنی جس دل کا تعلق اپنے رب سے ہے وہ زندہ ہے۔ اور جس کا تعلق اپنے رب سے نہیں وہ مردہ ہے"

اور یہ تعلق محبت کا ہے۔ اور محبت کا تمامتر سرمایہ محبوب کی اطاعت اور اس کی یاد ہے۔ اسی لئے فرمایا

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

اللھم ارزقنا حبک وحب حبیبک

ماہنامہ
المرشد
کا بدل اشتراک

زر سالانہ	۳۰ روپے
ششماہی	۱۸ ؍
فی پرچہ	۳ ؍؍

اشتہارات، نگارشات اور رابطہ کے لئے

۸۲۵ - سی ظفر کالونی سرگودھا

حافظ عبدالرزاق

کونوا عباد اللہ

۴۔ جھوٹ سے پرہیز اور راستبازی کا اہتمام کرنے کا کام خواہ کتنا آسان اور معمولی ہی کیوں نہ ہو، اس کے لئے کسی قدر محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ کام اگر دین کا ہے یا بظاہر دنیا کا ہو مگر اس کا ثمرہ آخرت میں مرتب ہونا ہو تو اس کے کرنے میں جو محنت کرنا پڑتی ہے اسے شرعی اصطلاح یا صوفیاء کی اصطلاح میں مجاہدہ کہتے ہیں۔ اس اصول پر غور کرنے سے فوری طور پر جو بات ذہن میں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ جو کام نہ کرنے کا ہے اس کے لئے نہ تو کسی محنت کی ضرورت ہے نہ مجاہدہ درکار ہے وہ افادیت کے اعتبار سے کرنے والے کام کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ کرنے کے کام کے لئے محنت یا جسمانی ہوگی یا مالی قربانی ہوگی یا وقت کی قربانی مگر نہ کرنے کے کام میں یہ تینوں چیزیں درکار نہیں ہاں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے اپنی خواہشات پر ضبط کرنا، اپنے جذبات پر کنٹرول کرنا اور یہ مجاہدہ گو مادی اور حسی نہیں بلکہ ذہنی اور باطنی ہے مگر ہے بڑا سخت مجاہدہ۔ کیونکہ خواہش کی قوت کا اندازہ شعر کی زبان میں یوں کیا گیا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی عملی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ کرنے کے سارے کام اعضائے جسمانی کی مدد سے انجام پاتے ہیں ہاتھ پاؤں آنکھ زبان وغیرہ میں سب سے آسان کام زبان کا ہے۔ اس کا دائرۂ عمل محدود ہے بس ایک انچ اوپر تلے حرکت کرتی ہے۔ تھکتی ہے نہ سست ہوتی ہے۔ اگر تعمیری پہلو کی طرف رخ کرے تو قوموں کی زندگی سنوار کے رکھ دے اور تخریب کی طرف رخ کرے تو ایسے فتنے برپا کرے کہ صدیوں تک اس کے اثرات زائل نہ ہوں۔ اس حقیقت کی طرف محسن انسانیت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم تربیت یافتہ شخص نے اشارہ فرمایا ہے۔ ترمذی میں ہے عن ابی سعید قال اذا اصبح ابن آدم فان الاعضاء کلھا تکفر اللسان فتقول اتق اللہ فینا فانما نحن بک فان استقمت استقمنا وان اعوججت اعوججنا۔

"یعنی صبح انسان کی آنکھ کھلتی ہے تو تمام اعضائے جسمانی بڑی منت وزاری سے زبان سے درخواست کرتے ہیں کہ اللہ سے ڈر ہمیں فتنوں میں مبتلا نہ کرنا۔ اگر تو دن بھر درست رہی ہے تو ہم سب اعضا کے اعمال درست ہوں گے اور اگر تجھ میں کجی پیدا ہوئی تو سارے اعضا کے اعمال میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔"

زبان سے کرنے کے کام ذکر الٰہی ہے تبلیغ و اشاعت دین ہے بنی نوع انسان کی خیر خواہی تدبیر بتانا اور بیان کرنا ہے۔ غرض اس کا حلقہ بڑا وسیع ہے اور ان میں سے ہر کام اپنی اہمیت کی مناسبت سے محنت اور مجاہدہ چاہتا ہے اور نہ کرنے کے کام خواہ تعداد کے اعتبار سے کتنے ہوں ان کی اصل صرف ایک ہے اور وہ ہے جھوٹ۔ اس پر آپ غور کریں تو معلوم ہوا کہ فضول گوئی ہو، گالی گلوچ ہو غیبت ہو۔ سب کی اصل جھوٹ ہی ہے۔ تو گویا زبان کے لئے بچنے کا کام بنیادی طور پر صرف ایک ہے کہ زبان جھوٹ سے بچے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کرنے اور نہ کرنے کا ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ:

من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیقل خیرا اولیصمت او کما قالؐ

"یعنی جس شخص کا اللہ تعالےٰ سے ایمان کا تعلق ہے اور اسے آخرت کا یقین ہے اسے چاہیئے کہ بولے تو حق اور مفید بات ہی زبان سے نکالے ورنہ خاموش رہے۔ ایسے موقعہ پر خاموش رہنا ہی سب سے بڑا مجاہدہ ہے۔"

حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان میں ایک اور نکتہ کا سراغ ملتا ہے کہ آدمی راستباز نہ ہو اور زبان پر کنٹرول نہ رکھے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالےٰ سے اس کا تعلق یا تو نہایت کمزور ہے یا سرے سے ہے ہی نہیں اور آخرت کا یقین بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بڑی محرومی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے جھوٹ کے نقصانات ایک عجیب ترتیب سے بیان فرمائے ہیں۔ ارشاد ہے:-

عن ابن مسعود ۔۔۔۔ وایاکم والکذب، فان الکذب یھدی الی الفجور وان الفجور یھدی الی النار ۔۔۔ (م ع)

(ایک طویل حدیث میں سے یہ حصہ جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے یہاں بیان کیا گیا ہے)

حضور ﷺ نے بڑی تاکید سے فرمایا کہ خبردار! جھوٹ سے بچ کر رہنا کیونکہ جھوٹ کی عادت سے اللہ کی نافرمانی کا جذبہ ابھرتا اور نشوونما پاتا ہے اور مسلسل اللہ کی نافرمانی انسان کو جہنم میں پہنچا کے چھوڑتی ہے۔

دیکھیے کہ ذرا سے بچنے کے کام سے آدمی نہ بچا تو اس کی سیرت داغدار ہوتے ہوتے یہاں تک بگڑی کہ اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن بنانے میں مشغول ہو گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس آدمی کا معمول ہی جھوٹ بولنا ہو اس کی حالت کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر جو جھوٹ کو عبادت سمجھے بلکہ ۹/۱۰ حصہ دین سمجھے اس بیچارے کی حالت کس قدر قابل رحم ہے۔

بعض کمزوریاں انسان میں ایسی ہو سکتی ہیں جو اس کی شخصیت اور سیرت کو داغدار تو کر دیتی ہیں مگر ایسی نہیں ہوتیں کہ وہ انسانیت کے مقام سے ہی گر جائے مگر یہ جھوٹ ایسی کمزوری ہے کہ جس کا ایمان سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:-

عن صفوان انہ قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایکون المومن جبانا؟ قال نعم، فقیل ایکون المومن بخیلا؟ قال نعم، فقیل ایکون

المؤمن کذاباً قال لا (مالک بیہقی)

"یعنی صحابہؓ میں سے کسی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا مومن بزدل اور ڈرپوک ہو سکتا ہے فرمایا ہاں، پھر پوچھا کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے فرمایا ہاں، پھر پوچھا کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے، فرمایا نہیں!"

ظاہر ہے کہ پہلی دو صفت واقعی کمزور سیرت کی علامات ہیں۔ لیکن کسی حد تک طبعی ہیں سراسر اختیاری نہیں ہیں اور جھوٹ بولنا تو کامل طور پر اختیاری امر ہے اور ظاہر ہے کہ غیر اختیاری امور قابل مواخذہ نہیں۔ مواخذہ صرف اختیاری امور پر ہے اس لئے جھوٹ اور ایمان کے جوڑ کی حضور اکرمؐ نے نفی فرما دی۔

اس آج کی گفتگو سے دو امور خصوصی توجہ کے قابل ہیں۔ اول یہ کہ مومن کے کرنے کے کاموں سے سلسلے میں جو تھا اور ضروری کام یہ ہے کہ جھوٹ سے بچنے کے لئے اس شدت سے اہتمام کرے جتنا کوئی جاندار آگ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے

دوم یہ کہ ہر محب وطن پاکستانی اس امر پر غور کرے کہ آج ہمارے معاشرے میں جس قدر بگاڑ پیدا ہو چکا ہے اس بگاڑ کی صورتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ان سب کی جڑ یہ جھوٹ ہی ہے۔ کہیں زبانی جھوٹ کہیں عملی جھوٹ جیسے بددیانتی کہیں چور بازاری ہو، ڈاکہ زنی ہو، سمگلنگ ہو، رشوت ہو غبن ہو۔ کام چوری ہو، دوسروں کے کام میں روڑے اٹکانے کا مشغلہ ہو ساری کی ساری جھوٹ کے مختلف روپ ہیں۔ کیا کوئی شخص جہنم کی فتنہ سامانیوں سے بچنے کے لئے اپنی اصلاح کے لئے آمادہ ہو سکے گا ۔

بیا در ید گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

ضروری اطلاع

۲۸ مئی ۱۹۸۱ء سے منارہ کا سالانہ اصلاحی اور تربیتی اجتماع شروع ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ ۲۶ جون تک جاری رہے گا۔

بحکم ناظم اعلیٰ

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حافظ عبدالرزاق ایم۔اے

انسان فطرۃً رہنمائی کا محتاج ہے۔ خالقِ انسان نے اس کی فطرت میں یہ خصوصیت رکھ کر روزِ اول سے ہی انسان کو تسلی دی بلکہ یقین دلایا کہ حقیقی رہنمائی میری طرف سے تمہیں ملتی رہے گی اور اس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ بنی نوع انسان کا جو فرد یا جماعت میری رہنمائی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اس زندگی نہایت سکون و راحت سے بسر ہوگی کسی قسم کی فکر کوئی غم یا اندیشہ اسے پریشان نہیں کر سکے گا اس حقیقت کی نشان دہی خالق نے اپنی کتاب ہدایت میں ان الفاظ میں فرمادی کہ:۔

فاما یاتینکم منی ھدیً فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولا ھم یحزنون

انسانی تاریخ کے ہر دور میں یہ سلسلہ جاری رہا ہر خطے میں خالق کی طرف سے ایسے رہنما حضرات تشریف لاتے رہے تا آنکہ انسانیت جب سنِ بلوغ کو پہنچ گئی تو ایک ایسا رہنما بھیجا گیا جس کے متعلق دو اہم اعلان کئے گئے۔

تبٰرک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ لیکون للعالمین نذیرا۔

یعنی خالقِ انسان نے اپنی یہ آخری کتاب ہدایت بھیج دی ہے جو انسانیت کی ہر پہلو رہنمائی کے لئے کافی و وافی ہے دوسرا اعلان یہ کہ رہنما کوئی وقتی قومی یا ملکی بنیاد پر رہنمائی کا اہتمام نہیں کرے گا بلکہ اس کی رہنمائی قیام قیامت تک کے لئے تمام اقوام عالم کے لئے اور تمام دنیا بلکہ دنیاؤں کے لئے ہے پھر اس کی تکمیل کے لئے یا تاکید کے لئے ایک اور اہم اعلان فرمایا کہ میں نے ابتدائے آفرینش کے وقت جو ضمانت دی تھی آج اس کی تکمیل ہوگئی لہٰذا اس کے بعد میری طرف سے کوئی نیا رہنما تمہاری رہنمائی کے لئے بھیجا نہیں جائے گا

الف اعلانات کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ:۔

۱۔ اس آخری کتاب ہدایت کی تعلیمات ایسی جامع و مانع ہوں کہ انسان کو رہنمائی کے لئے اس کے علاوہ کسی کی احتیاج باقی نہ رہے۔

۲۔ اس کتاب ہدایت کی حفاظت کا ایسا انتظام ہو کہ اس کے متن اور مفہوم میں کوئی تبدیلی نہ کی جا سکے۔

۳۔ یہ آخری رہنما اپنی مخصوص رہنمائی اور تربیت کے ذریعہ کوئی ایسی جماعت تیار کرے جو اس آخری کتاب ہدایت کی تعلیمات کی جیتی پھرتی اور عملی تفسیر ہو، کیونکہ زندگی کا نقشہ صرف تحریری اصولوں پر نہیں بنتا بلکہ ان اصولوں کی عملی تعبیر کی جو صورت مشاہدے پر آئے اس کے مطابق

بنتا ہے۔ غالباً اسی حقیقت کی وضاحت فرماتے ہوئے جہاں یہ اعلان ہوا کہ ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم وہاں یہ بھی تاکید کی گئی کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ یعنی تم نے رہنما اصول اس کتاب سے لینے ہیں اور ان اصولوں کی عملی تعبیر اس کی آخری رہنما کی حیاۃ طیبہ اور سیرت مطہرہ سے سیکھنی ہے۔

اس آخری رہنما نے مذکورہ بالا تینوں تقاضوں کو پورا کرنے کی نہ صرف کوشش کی بلکہ عملاً کر کے دکھا دیا۔ چنانچہ آخری شق کی تکمیل کے لئے جو جماعت تیار ہوئی اس کی کچھ خصوصیات خود خالق انسان نے بیان فرما دیں مثلاً پہلی خصوصیت یہ فرمائی کہ میرے اس آخری رہنما کے بعد پوری انسانیت کو اس مقدس جماعت کی پیروی کرنا ہو گی جو میرے اس آخری نمائندے نے خود اپنی نگرانی میں ذاتی تربیت سے تیار کی۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:۔

والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ واعد لھم جنات تجری تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدا ذلک الفوز العظیم ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت، نجات اور کامیابی کو ایک مثلث میں محصور کر دیا جس کے تین اضلاع مہاجرین، انصار اور ان کی پیروی کرنا ہے مہاجرین و انصار کے ساتھ کوئی قید یا شرط نہیں لگائی مگر ان کی پیروی کرنے والوں کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ یہ پیروی محض ضابطہ کی کارروائی نہ ہو بلکہ دلی جذبے اور قلبی محبت سے ہو۔ یعنی اتباع کے ساتھ باحسان کی قید نہایت اہم شرط ہے۔

پھر ان تینوں گروہوں کے لئے ان کی محنت کی اُجرت کی نشاندہی فرمائی کہ:

ا۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔

ب۔ جنت اُن کے لئے پہلے سے تیار کر رکھی ہے

ج۔ جنت میں ان کا قیام دائمی ہے۔

الغرض تینوں انعامات کے بعد یہ بھی اعلان فرما دیا کہ سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔

راندش کلام سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر یہ تمام انعامات مہاجرین و انصار کا حق ہے۔ ان کے علاوہ جسے یہ انعامات ملیں گے وہ صرف ان کی اتباع اور سچے دل سے اتباع کرنے والوں کو ملیں گے۔ یوں لگتا ہے جیسے اصل مہمان تو یہی لوگ ہیں باقی سب طفیلی ہیں۔

یہ قاعدہ ہے اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہر گروہ کے مختلف افراد میں فرق مراتب ہوتا ہے اس ہادی و مہدی جماعت کے معاملے میں بھی کچھ اسی قسم کی نشاندہی کی گئی ہے ارشاد ہے:۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنیٰ۔

"یعنی اسلام کی تاریخ میں فتح مکہ سے پہلے کا زمانہ نہایت صبر آزما دور تھا اس لئے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے باطل کے مقابلے میں جانی اور مالی قربانیاں دیں ان کا مرتبہ اللہ کے نزدیک اُن لوگوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے جو فتح مکہ کے بعد باطل کے مقابلے میں جان و مال سے سینہ سپر رہے۔"

مگر اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ دونوں جماعتیں بڑی پسندیدہ جماعتیں ہیں اور میں نے ان سے انعامات کا وعدہ کر رکھا ہے ظاہر ہے کہ اس گروہ میں ایسے افراد بھی ہیں جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اور بعد دونوں موقعوں پر جانی اور مالی قربانیاں پیش کی تھیں۔ لہذا ان کے مرتبہ اور درجہ کی بلندی کا اندازہ کر لیجئے۔

آج کل کے دنیا کے سیاسی حالات میں بالعموم اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ کاروبار حکومت چلانے کے لئے انتخابات ہوا کرتے ہیں۔ عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں، جو رکن یا ممبر کہلاتے ہیں پھر ان میں سے وزراء منتخب ہوتے ہیں پھر ان وزراء میں سے وزیر اعظم اور صدر منتخب ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق یہی تصور دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ سوسائٹی کا مکھن ہیں مگر سب سے پہلے تو عوام کی رائے فیصلہ کن شمار ہوتی ہے یعنی عوام کی عقل علم، دیانت ہی معیار حسن و قبح ہے اس لئے اس کا امکان بھی موجود ہے کہ جیسا دودھ ہوگا ویسا ہی مکھن۔ مثلاً دودھ اگر زہریلا ہے تو مکھن نہ صرف زہریلا ہوگا بلکہ سارے دودھ کا زہر سمٹ کر اس مکھن میں جمع ہو جائے گا اور وہ مکھن دودھ سے بھی زیادہ زہریلا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی قانون انتخاب نظر آتا ہے مثلاً

اللہ یجتبی من الملائکۃ رسلا ومن الناس

"یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں اور آدمیوں میں سے اپنے رسول انتخاب کر لیتا ہے، پھر رسولوں میں سے اولوالعزم رسول چنے پھر ان میں خاتم النبیین اور امام الانبیاء کو چن لیا۔ مگر اللہ کے انتخاب کو دیکھیں بندوں کے انتخاب پر قیاس نہ کر لینا وہ تو سمیع و بصیر اور علیم و خبیر کا انتخاب ہے لہذا اس کے انتخاب کے متعلق ذہن میں ادنیٰ سا شبہ پیدا ہونا بھی سب سے بڑی بربادی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاء کی تربیت یافتہ جماعت میں بھی انتخاب کا قانون جاری رکھا۔ اور اس انتخاب میں انسانی زندگی کے دونوں پہلو بیان فرمائے یعنی ایمان اور عمل ایمان کے سلسلے میں ارشاد ہے:

الذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اٰووا ونصروا اولئک ھم المومنون حقا۔

خلاصہ یہ کہ مہاجرین و انصار حقیقی مومن ہیں یہ سند اس دنیا کی زندگی میں صرف اسی جماعت ہی کو ملی اس انتخاب کی شان کا کیا کہنا کہ اس جماعت کے ایمان کو ایسا پیمانہ اور معیار قرار دیدیا کہ بعد میں آنے والوں کے ایمان اسی پیمانے سے ناپے جائیں گے اور اسی معیار پر پرکھے جائیں گے ارشاد باری ہے۔

فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا

"یعنی اے میرے نبی کے تربیت یافتہ لوگو! تمہارا مقام یہ ہے کہ دوسرے لوگ اگر اس طرح ایمان لائے جیسے تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پالیں گے۔"

یعنی اس جماعت کو ایمانی اعتبار سے اس طرح انتخاب کر لیا کہ ہدایت کے نقطہ کا مفہوم ہی اس جماعت کا ایمان ہے۔

پھر عملی اعتبار سے اس جماعت کو انعامات کا وعدہ دے کر درجات متعین فرمادئے کہ فتح مکہ سے پہلے قربانی دینے والوں کا درجہ بعد کے لوگوں سے بدرجہا زیادہ بلند ہے۔

پھر انتخاب کا سلسلہ آگے چلا تو ان لوگوں میں سے بھی دس حضرات کو نام لے کر جنت کی بشارت دی گئی۔ یہ دونوں خصوصیات

پوری انسانیت میں صرف اسی جماعت میں پائی جاتی ہیں۔

پھر اس سے آگے جو انتخاب کا سلسلہ چلا تو اس کے بیان کے لئے مختلف انداز بیان اختیار کئے گئے۔

مثلاً یہ اصول بتایا کہ تم میں سے سب سے زیادہ قابل احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم

پھر اس اصول کا اطلاق واقعاتی اعتبار سے کر کے بتایا اور اس میں بھی تدریج کا پہلو اختیار فرمایا چنانچہ ارشاد ہوا۔

والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون۔

"یعنی جو سچ لے کے آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی تو متقی ہیں"

اس آیت کو سننے والوں نے اور موقع کے گواہوں نے یہی بتایا کہ وصدق بہ سے مراد اس مقام پر ایک ہی شخص ہے جس کو صدیق کا لقب عطا ہوا۔

عربی زبان کی باریکیاں جاننے والے ہی سمجھ سکتے کہ اولئک ھم المتقون کا مفہوم کیا ہے

متقی کہنے کے بعد اس انتخاب کا بیان دوسرے انداز میں ہوا وسیجنبھا الاتقی الذی یؤتی مالہ یتزکی

تمام اہل علم یہی بتاتے ہیں کہ الاتقی سے مراد صدیق اکبرؓ ہیں۔

اب ترتیب یوں بنی کہ اللہ تعالےٰ نے:۔

۱۔ قرآن کریم کی آخری کتاب ہدایت ہونے کا اعلان فرمادیا

۲۔ حضور نبی کریمؐ کے آخری نبی ہونے کا اعلان فرمادیا۔

۳۔ قرآن کریم کی حفاظت کا انتظام اپنے ذمے لے لیا۔

۴۔ ایمان کے اعتبار سے حضور اکرمؐ کی تربیت یافتہ جماعت کو معیار قرار دے دیا۔

۵۔ عملی اعتبار سے اس جماعت کی پیروی کرنے کو عظیم کامیابی قرار دیدیا۔

۶۔ درجات کے اعتبار سے ان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک ایک اعلیٰ درجہ دوسرا اس سے کم۔

۷۔ پھر اعلیٰ درجہ والوں میں سے دس آدمیوں کا انتخاب فرما کر انہیں عشرہ مبشرہ کے لقب سے نوازا گیا۔

۸۔ پھر ان دس میں سے اتقیٰ کی نشاندہی کی گئی

۹۔ پھر اتقیٰ کو "اکرم عند اللہ" قرار دیا گیا۔

۱۰۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متقی اتقی اور اکرم عند اللہ کی عملی تعبیر فرماتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت ہدایت کے مرکز مصدر اور منبع مسجد نبوی میں اپنے مصلیٰ پر صدیق اکبرؓ کو کھڑا کر دیا اور ہدایت کے مرکز پر بندے اور رب کے درمیان سترہ ملاقاتوں میں صدیق اکبرؓ کی قیادت کا نظارہ خود اپنی چشم مبارک سے دیکھا اس انتخاب کا اصول تو انتخاب کرنے والا ہی صحیح طور پر جانتا ہے مگر اس کے اشارات کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک شیعہ محقق علامہ نور اللہ شوستری اپنی معرکۃ الآرا کتاب مجالس المومنین میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا

ما سبقکم ابو بکر بصوم ولا صلوٰۃ ولکن لشیئ وقر فی صدرہ

"یعنی ابوبکر جو تم سب لوگوں سے سبقت لے گیا ہے تو وہ نماز روزہ کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک ایسی چیز کی وجہ سے ہے جو اس کے دل میں بھر دی گئی ہے۔"

اس حدیث کے متعلق پہلی بات یہ ہے کہ محقق شوستری نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ایسی ہے جو نبی کریمؐ ہمیشہ بیان فرمایا کرتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بندوں میں ایک دوسری سے سبقت لے جانے کے لئے اور اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کرنے کی دو صورتیں اس حدیث میں بیان ہوئی، اوّل نماز روزہ، دوم وہ چیز جو دل کی گہرائیوں میں جم گئی ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ نماز روزہ کا تعلق اعضاء جوارح سے ہے جن کا اعمال محسوس ہوتے ہیں اور مشاہدے میں آتے ہیں۔ مگر قلب کی چیز غیر مرئی غیر مادی اور غیر حسی ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اصل دارومدار اس قلب کی چیز پر ہے اعمال جوارح تو محض اس کے مظہر ہوتے ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ دل میں بھری جانے والی چیز کیا ہے۔ علمائے اخلاق کا یہ کہنا ہے کہ دل جذبات کا مرکز ہے اور جذبات میں سے سب سے قوی جذبہ "محبت" کا جذبہ ہے جذبات کی قوت کا اقرار تو حال کے ماہر نفسیات نے بھی کیا ہے بلکہ پروفیسر جوڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "ہماری عقل جذبات کے پیچھے یوں چلتی ہے جیسے کتے کے پاؤں اس کی ناک کے پیچھے چلتے ہیں" یعنی جذبات کے سامنے عقل ہتھیار ڈال دیتی ہے یہی حقیقت ایک مسلمان عارف نے کہی ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یہ امر طے ہو گیا، دل میں بھری جانے والی چیز محبت ہے اور عند اللہ وہی محبت قابل قدر ہے جو اللہ سے ہو یا اللہ کے رسولؐ سے ہو اور یہ دو چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کی دو کیفیتیں ہیں۔ مگر محبت مادی یا حسی چیز نہیں جو نظر آسکے یا حواس کی زد میں آجائے۔ اس لئے محبت کا محض دعویٰ بھی ہو سکتا ہے اور فی الحقیقت محبت بھی پائی جا سکتی ہے نرے دعویٰ کے ساتھ محبت کی ایکٹنگ ضرور کرنا پڑتی ہے بہروپ بنانا پڑتا ہے، آپ دیکھتے نہیں ڈراموں میں اور سینما میں ہر جگہ محبت کی ایکٹنگ ہوتی ہے مگر اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ انسان کی سوچ کا رُخ سنجیدہ مسائل سے موڑ کر وقتی لذت پرستی کی طرف اسے مائل کر دیا جائے اور اس نشے میں انسان کو بدمست کر کے اس کی جیب کتر لی جائے بلکہ فن کا کمال یہ ہے کہ ؎

خود نچیر کے دل میں ہو پیدا ذوق نخچیری

اور جہاں حقیقی محبت ہو وہاں ایکٹنگ نہیں ہوتی بہروپ نہیں بدلے جاتے سوانگ نہیں بھرے جاتے بلکہ وہاں تو اس اعلان پر کان لگائے رہتے ہیں۔

قل ان کان اٰباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یأتی اللہ بامرہ

"یعنی اے میرے حبیب کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن میں رہنے کو تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو تم منتظر رہو یہاں تک

اللہ تعالیٰ انہیں سزا دینے کا حکم جاری فرما دے۔

مختصر یہ کہ محبت نام ہے محبوب کے لئے قربانی دینے کا اور قربانی نام ہے وہ چیز پیش کر دینے کا جو اپنی ملکیت میں بھی اور پیاری بھی ہو۔ اور انسان کو طبعاً پیار کئی چیزوں سے ہوتا ہے مثلاً اپنی ذات اپنی راحت اور آرام سے، اپنے اہل و عیال سے اپنے مال و دولت سے اپنے گھر بار سے، اور اپنی خواہش اور پسند سے، قربانی کا اطلاق اس وقت ہوگا جب اُن میں سے کوئی چیز یا سبھی چیزیں محبوب کے مطالبہ پر بخوشی بلکہ بشوق پیش کی جائیں۔

آیئے ذرا دیکھیں صدیق اکبرؓ نے اللہ و رسول کے لئے ان میں سے کسی چیز کی قربانی دی کہ یہ یقین ہو جائے کہ صدیق کا دل اللہ و رسول کی محبت سے لبریز ہے۔

۱۔ اپنی ذات آرام اور راحت کی قربانی:۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ صدیق اکبرؓ ایک نہایت کامیاب اور مالدار تاجر تھے، تجارت کے پیشہ میں بالعموم یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ یہ لوگ اپنے مفاد اپنے آرام اور اپنی راحت کی زیادہ فکر کیا کرتے ہیں، سہل انگار ہوتے ہیں کوئی زیادہ فکر اور جفاکشی کی طرف مائل نہیں ہوتے ہیں اس کے باوجود صدیق اکبرؓ نے اسلام لاتے ہی اپنے مفاد اور اپنے آرام کو تج دیا۔ ان کے ابتدائی دور کا یہ واقعہ تو مشہور ہے کہ اسلام کا اعلان کرنے پر انہیں شدت سے زدوکوب کیا گیا کہ روز بے ہوش رہے مگر جب بھی ہوش آئی تو یہی پوچھا کہ نبی کریم کا کیا حال ہے یعنی اس حالت میں بھی اپنے حال کی بجائے محبوب کے حال کی فکر ہے۔

پھر ہجرت کے وقت اپنی جان کو اپنی آرام و مرضی سے خود خطرے میں ڈالا قریش کو دشمنی تو نبی کریم سے تھی اور وہ حضورؐ ہی کی جان کے درپے تھے۔ مگر صدیقؓ نے اپنی جان کا خطرہ خود مول لیا۔ اس رفاقت کی اہمیت قریش مکہ نے بھی محسوس کر لی چنانچہ صدیق اکبرؓ کی گرفتاری کا انعام بھی وہی سو اونٹ مقرر کیا جو نبی کریمؐ کے سلسلے میں مقرر کیا تھا۔

۲۔ اہل و عیال کی قربانی:۔

ہجرت کے لئے تیاری کے وقت صدیق اکبرؓ کے گھر کے افراد ہمہ تن تیاری میں مصروف رہے جب غار ثور میں تین دن رہنا پڑا تو بیٹا دن بھر کی خبریں پہنچاتے جاتا۔ غلام عامر بن فہیرہ بکریاں لے جاتا اور حضور کریمؐ کے لئے دودھ مہیا کرتا گویا صدیق کا سارا کنبہ ہی تن من دھن سے حضورؐ پر فدا ہو رہا تھا۔

۳۔ گھر بار:۔

ہجرت کے وقت ظاہر ہے کہ سب کچھ چھوڑ دیا۔

۴۔ مال و دولت:۔

صدیق اکبرؓ نے جب اسلام قبول کیا ۴۰ ہزار نقد پاس موجود تھا۔ مگر ابتدائی تیرہ برس سے یہ سب مال قربان کر دیا اس انفاق مال کی کئی صورتیں تھیں۔ مثلاً

(۱) غلام اور کنیزیں اسلام قبول کر لیتی ان کے مالک انہیں سخت ایذائیں دیتے چنانچہ صدیق اکبرؓ ان مشرکوں سے وہ غلام خرید لیتے اور انہیں آزاد کر دیتے۔ سات غلاموں اور کنیزوں کے نام تو مشہور رہیں۔

(ب) دینی ضروریات پر خرچ کیا کرتے تھے۔

یہ سلسلہ مکہ کے بعد مدینہ میں بھی جاری رہا۔

چنانچہ مکہ میں حضورؐ کے سفر ہجرت کے لئے اونٹنی خریدی مدینہ میں مسجد نبوی کے لئے زمین خریدی۔

(ج) جنگی اخراجات کے لئے مالی قربانی ہر موقعہ پر سب سے زیادہ پیش کی حتیٰ کہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر تو انتہا ہی کر دیا کہ گھر میں جو کچھ تھا سب لاکر حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا اور قیامت تک آنے والوں کے لئے محبت کا معیار قائم کرتے ہوئے یہ اعلان کر گئے کہ ؎

پروانوں کو چراغ عنادل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

صدیق اکبرؓ کی مالی قربانیوں کا اندازہ کرنا ہو تو صدیقؓ کے آنے اور جانے کے دو مناظر کا تقابلی مطالعہ کر لیجئے۔

صدیق آیا تو ۴۰ ہزار نقد پاس تھے
گیا تو صاحب اقتدار اور خلیفۂ رسولؐ کی حیثیت سے گیا مگر پاس لیا تھا۔ ایک غلام ایک لونڈی اور ایک اونٹنی۔

لوگ بالعموم اقتدار میں آتے ہیں لوٹنے کے لئے صدیقؓ اقتدار میں آیا تو لٹ جانے کے لئے لوگ اقتدار حاصل کرتے ہیں سمیٹنے کے لئے صدیق نے اقتدار لیا تو پھیلانے کے لئے لوگ حکومت کو جمع کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ صدیق نے حکومت کو اہل حاجت میں تقسیم کا ذریعہ بنایا۔

مختصر یہ ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کی قربانی کا مطالبہ کیا ہے صدیقؓ نے ان سب چیزوں کی قربانی دیکر محبت کا حق ادا کر دیا جبھی تو محبوب نے اعلان فرمایا کہ جس نے مجھ پر کوئی احسان کیا میں نے اس کا بدلہ چکا دیا مگر صدیقؓ کے احسان کا بدلہ اللہ تعالیٰ دیگا۔ مجھے اور دین کو جو فائدہ صدیق کے مال نے پہنچایا وہ کسی کے مال نے نہیں پہنچایا ؎

بناکردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اللھم ارزقنا حبك وحب من یحبك وحب عمل یقربنا الی حبك

لنگر مخدوم۔ کے اجتماع کی تاریخوں میں تبدیلی

نوٹ فرمائیے!

۱۸ اکتوبر کی بجائے یہ اجتماع ۱۵۔ اکتوبر کو ہوگا

بحکم ناظم اعلیٰ

گذشتہ سے پیوستہ

تصوّف اور تعمیرِ سیرت

حافظ عبد الرزاق

چھٹا لطیفہ :-

اصطلاحِ سلوک میں اس کو نفس کہتے ہیں۔ نفس، انسان کے اندر ایک قوت ہے جس سے وہ کسی چیز کی خواہش کرتا ہے خواہش اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی۔ اس اختلاف کی بنا پر نفس کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں اور ان کے نام بھی مختلف ہیں مثلاً نفس چونکہ اکثر بُرائی اور فوری لذت کی خواہش کرتا ہے جب یہ خواہش کر بیٹھے اور اس پر نادم بھی نہ ہو تو اسے نفسِ امّارہ کہتے ہیں یعنی وہ قوت جو اکثر بُرائی کی خواہش ہی آتی ہے، اسی صورت کو ہوس یا ہوائے نفس بھی کہتے ہیں اور اگر نفس بُرائی کی خواہش کرے مگر اس پر ندامت بھی ہونے لگے، تو اسے نفسِ لوّامہ کہتے ہیں یعنی اپنے کئے پر ملامت کرنے کا احساس بھی پایا گیا اور اگر یہ قوت اکثر نیکی اور بھلائی کی خواہش کرنے لگے تو اس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔

اس لطیفہ کی تربیت کا مطلب یہ ہے کہ سالک اس قوت کو اللہ کے ذکر کے ذریعے اس قابل بنانا چاہتا ہے کہ اکثر خیر کی خواہش پیدا ہونے لگے۔ اس لطیفہ کے راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سالک کے اندر یہ قوت اب صحیح رُخ پر کام کرنے لگی ہے نیکی کی رغبت اور بُرائی سے نفرت ہونے لگی ہے۔

یوں تو شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے مگر نفس اس سے بھی بڑھا ہوا ہے شیطان کے اندر بھی تو نفس ہی نے استکبار کی خواہش پیدا کر کے اسے گمراہ کیا تھا۔ اس لئے اسے مغلوب کرنا مشکل کام ہے اس لئے حضور اکرمؐ نے مجاہدۂ نفس کو جہادِ اکبر فرمایا تھا اور اللہ تعالےٰ نے اپنے ایک برگزیدہ رسولؑ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ

"یعنی ہوائے نفس کا اتباع مت کیجئے ورنہ یہ اتباع تمہیں راہِ حق سے ہٹا دے گی"

دوسرے مقام پر ایک اصولی تعلیم فرمائی :-

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۔

"یعنی جسے اللہ تعالےٰ کے سامنے جوابدہی کا خوف ہوا اور اس اپنے آپ کو ہوائے نفس کی اتباع سے بچا لیا وہ جنت کے انعام کا مستحق ہوا"۔ معلوم ہوا کہ ہوائے نفس کی اتباع گمراہی ہے اور ہوائے نفس سے بچنا اصل کامیابی ہے۔

خواہشاتِ نفسانی کی کوئی حد نہیں یہ ایک ایسا جنگل ہے کہ جو اس میں پھنس گیا وہ پھڑ پھڑا تو سکتا ہے لیکن نکلنا محال ہے کیونکہ خواہش پرستی انسان کی دشمن ہے مگر محبوب دشمن اس لئے خواہشات جوں جوں پوری ہوتی ہیں ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہی جاتا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

انسان اپنی ہوائے نفس کو پورا کرنے کے لاکھ جتن کرتا ہے لیکن جب جاہ ہے، لیکن جب مال ہے کہیں تلاش راحت ہے کہیں جستجوئے لذت ہے، انسان ان کے حصول کے لئے سارے جتن کرتا ہے مگر طبیعت سیر نہیں ہوتی، حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

گھٹتا جاتا ہے خط پیمانہ
بڑھتی جاتی ہے تشنگی ساقی

ذکر الٰہی کی برکت سے اس قوت کی تسخیر یوں ہوتی ہے کہ اب نفس زیادہ تر خیر کی خواہش ہی کرتے لگتا ہے۔ مگر خیر کیا ہے تفصیل میں پڑے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ اصل خیر یہ ہے کہ نبی کریم کے اسوہ حسنہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عزم اور سلیقہ سیکھ لو، تو صورت یہ بنی کہ سالک اپنی پسند سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اپنی پسند کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کے تحت کر دیتا ہے، خواہش ہمیشہ پسندیدہ چیز کی ہوتی ہے جب سالک نے اپنی پسند کو حضورؐ کی پسند کے تحت کر دیا تو لازماً وہ خیر ہی کی خواہش کرے گا۔ یہ جو عام طور پر مشہور ہو گیا کہ نفس کشی کرنا ہی سلوک و تصوف ہے یہ اس خاص مفہوم کے اعتبار سے غلط ہے نفس مارنا نہیں بلکہ نفس کو سدھارنا، سنوارنا اور صحیح راہ پر لگانا ہے یعنی اس سے کام لینا ہے، مگر صحیح کام، اگر یہ مر گیا تو گویا وہ قوت ہی ختم ہو گئی جو خواہش کرتی تھی خواہ وہ خواہش خیر ہو یا خواہش شر۔ تو وہ زندگی کیا ہوئی۔

اگر کوئی نابینا آدمی کہے کہ ہم تو کبھی کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تو اس میں کونسا کمال ہوا۔ بات جب ہے کہ شعور موجود ہے حسن کا ادراک موجود ہے دو کھلی آنکھیں موجود ہیں پھر بھی غیر محرم کی طرف نظر نہیں اٹھتی یہ کیوں؟

اس لئے کہ اب اس قوت کی تربیت ہو چکی ہے محبوب کو اس طرف آنکھ اٹھانا پسند نہیں اس لئے اب آنکھ کھلی ہے مگر نظر نہیں اٹھتی۔

ہاں اس لحاظ سے نفس کشی کہا جائے کہ نفس میں جو برائی کی خواہش تھی وہ مر گئی تو مفہوم درست ہے مگر درحقیقت اس کا عام فہم اور واضح مفہوم یہ ہے کہ نفس کی صحیح تربیت ہو گئی۔

اس لطیفہ کا خاصہ یہ ہے کہ سالک میں "فانی" کی محبت اور اس سے حصول لذت کا جذبہ گھٹنے لگے اور "باقی" کی محبت اور ابدی راحتوں کے حصول کی خواہش بڑھنے لگے۔ اور جب یہ جذبہ درست ہو جائے اور قوت صحیح سمت میں کام کرنے لگے تو اس کے سامنے صرف وہی صراط مستقیم ہو جس کے سرے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے بلا رہے ہوں کہ

ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی

میرا راستہ یہی ہے اسی پر بڑھتے چلے آؤ۔ میں تمہیں اللہ کے پاس لے جاؤں گا۔ اور اسی پر وہ قافلے چلتے آئے ہیں جنہوں نے میرے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے صرف میرا اتباع کیا۔

ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا

چھ لطائف ان کی تربیت، سالک پر ان کے اثرات اور سالک کی عملی زندگی سے ان کا تعلق بیان ہو چکا۔ آج ساتویں لطیفے کا بیان ہو گا اس لطیفے کا اصطلاحی نام سلطان الاذکار ہے اسے لطیفہ قالبیہ بھی کہتے ہیں۔

قلب جب منور ہو جاتا ہے تو قالب پر اثر انداز ہوتا ہے، باطن کا جب تزکیہ ہو جاتا ہے تو ظاہر اس کی شہادت دیتا ہے، باطن کا جب تزکیہ ہو جاتا ہے تو ظاہر اس کی شہادت دیتا ہے بیٹری جب چارج ہو جاتی ہے تو اس سے بلب بھی روشن ہوتے ہیں موٹر بھی حرکت

میں آجاتی ہے ٹارچ میں جب نئے سیل ڈالے جاتے ہیں تو وہ روشنی پھیلنے لگتی ہے، سیل کے بغیر ٹارچ محض کھوکھا ہے ایک کھلونا ہے جس کام کے لئے اسے بنایا گیا وہ کام نہیں دے سکتی بیٹری اگر ڈاؤن ہوگئی ہے یا ختم ہے تو موٹر خواہ کتنی قیمتی ہو سواری کا کام نہیں دے سکتی باطن کا جب تک تزکیہ نہ ہو تو ظاہر آوارگی اور بے مقصدیت کا شکار ہو جاتا ہے قلب جب تک منور نہ ہو قالب پر ظلمتیں چھائی رہتی ہیں تزکیہ باطن یا لطائف کا جاری ہونا منور ہونا روشن ہونا ایسا ہے جیسے بیٹری چارج ہوگئی سسٹم کا ذخیرہ ہوگیا اب اس بیٹری یا سسٹم سے کام لینا ہے یہ سب فیلڈ ورک کے لئے تیاری تھی۔ عملی کام کی بنیاد تھی۔

انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو آلہ کار اس کے اعضاء ہوتے ہیں باطن سے ارادہ اٹھتا ہے اعضاء ہوتے ہیں باطن سے ارادہ اٹھتا ہے اعضاء حرکت میں آجاتے ہیں اور یہ قالب یا جسم انسانی چند اعضاء کا مجموعہ ہی تو ہے۔ سلطان الذکر کی تربیت یوں ہوتی ہے کہ اسم ذات کے ذکر کرتے ہوئے اس کا اثر سارے قالب میں جاری و ساری ہو جائے جیسے بجلی کے مثبت تار کو جب مس کیا جائے تو برقی رو سارے جسم میں دوڑ جاتی ہے رواں رواں محسوس کرتا ہے اسی طرح سلطان الذکر سے سارے بدن کو تمام اعضاء کو بال بال کو، خون کے ہر قطرے کو ذاکر بنایا جاتا ہے اس لطیفے کے راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے اس میں صلاح و تقویٰ کے کارسپل شامل کر دئے گئے اس نے ذہن کو جو قوت دی اس سے اس کی سوچ کی سمت رضائے الٰہی کی طرف ہوگئی ہاتھ اٹھے تو مخلوق کی بہتری کے لئے اور حق کی معاونت کے لئے آنکھوں نے حق کے بغیر دیکھنے سے انکار کر دیا کان کی آواز سننے پر آمادہ رہے غرض جسم کا ہر عضو حق کی سربلندی اور مخلوق کی بہتری میں مشغول ہوگیا چونکہ قرب الٰہی کا مدار عمل پر ہے اور اس عمل کا مدار اعضاء پر ہے اس لئے فرائض کی ادائیگی کے متعلق سوال بھی انہی سے ہوگا۔

ارشاد باری ہے کہ:۔

ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ زیادہ تر سامعہ اور باصرہ سے ہی ہوتی ہے اور ان معلومات کی روشنی میں عمل کا ارادہ قلب سے اٹھتا ہے اس لئے انہی سے باز پرس بھی ہوگی اور ان قوتوں سے غلط کام لینے والے اس کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے۔

لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر

"یعنی اگر ہم اہل اللہ سے اللہ کی باتیں گوش ہوش سے سنتے یا خود صحیح سمت میں سوچتے تو آج دوزخ کا ایندھن نہ بنتے"

یہاں ایک نکتہ ضمناً سامنے آگیا۔ انسان دو قسم کے ہی پائے جاتے ہیں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو اہل علم پر اعتماد کر کے ان کی سن کر زندگی کی راہ متعین کرتے ہیں ان کو ارباب تقلید ہی کہا جا سکتا ہے دوسرے وہ ہوتے ہیں جو ماہرین پر اعتماد کرنے کی بجائے خود تحقیق کی کوشش کرتے ہیں اگر وہ تحقیق کے واقعی اہل ہوں اور تحقیق کے لئے مطلوبہ شرائط بھی پوری کریں تو راہ ہدایت پا لیتے ہیں ورنہ ہوتا یوں ہے کہ تقلید سے انکار کے باوجود ہر کرمہ کی تقلید کرتے ہیں صرف اہل حق کی تقلید سے بدکتے ہیں۔ اور چونکہ ہر مدعی تحقیق اور منکر تقلید محقق تو ہوتا نہیں۔ اس لئے انہیں تقلید کرنا ہی پڑتی ہے۔ تو آیت کے اس ٹکڑے سے معلوم ہوا کہ دوزخ سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے ہیں اہل فن کی تقلید یا حقیقی تحقیق۔

جوابدہی اور مؤاخذے کی بات چلی ہے تو کہیں یہ خیال نہ کرنے پائے کہ عمر بھر جس زبان سے جھوٹی سچی بیان بازی سے کام لیتے ہیں کیا اس وقت یہ گنگ ہو جائے گی؟ بات یہ ہے کہ زندگی کے سارے اعمال صرف زبان ہی سے نہیں ہوتے جسم کے تمام اعضاء اپنی اپنی استعداد کے مطابق کاروبار حیات میں حصہ لیتے ہیں پھر انسان اس زبان کو سچ اور جھوٹ دونوں جگہ استعمال کرنے کا عادی ہوتا ہے مثلاً کسی کاغذ پر انگوٹھا لگایا، زبان سے انکار کر دیا کہ میرا انگوٹھا نہیں مگر وہ نقوش جب ماہر کے سامنے آتے ہیں تو فیصلہ دے دیتا ہے کہ یہ انگوٹھا اسی کا ہے زبان نے تو انکار کر دیا مگر ہاتھ انکار نہ کر سکا تو وہاں بھی مؤاخذہ کے وقت کچھ ایسی کیفیت ہوگی۔

الیوم نختم علیٰ افواھھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون۔

"یعنی وہاں بولنے کی اجازت نہ ہوگی بلکہ انسان دیکھے گا کہ ہاتھ بولتے ہیں، پاؤں بولتے ہیں اور صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ اس بھلے مانس نے ہم سے یہ یہ کام لیا۔"

دوسرے مقام پر مؤاخذے کا منظر ذرا تفصیل سے کھینچا گیا ہے۔ حتیٰ اذا ما جاؤھا شھد علیھم سمعھم وابصارھم وجلودھم بما کانوا یعلمون۔

"یعنی جب وہ جواب دہی کے لئے پیش ہوں گے ان کے کان ان کی آنکھیں بلکہ ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی یہ سن کر وہ لوگ حیرت میں ڈوب جائیں گے کہ یہ تو ہمارے صفائی کے گواہ تھے انہیں کیا ہو گیا مگر بات سوچ تک ہی محدود نہ رہے گی بلکہ:۔

وقالوا لجلودھم لم شھدتم علینا قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شیٔ وھو خلقکم اول مرۃ

"اپنی کھالوں سے کہیں گے اے ہماری بے زبان کھالو! تمہیں بولنے کا یارا کیسے ہوا کھالیں جواب دیں گی۔ ارے عقل کے اندھو، اور خالق کی قدرت سے آنکھیں پھیر لینے والو جس نے گوشت کے ایک ٹکڑے زبان کو وہاں قوت گویائی دی تھی کیا یہاں ہمیں گویائی دینے کی قدرت نہیں رکھتا۔

لطیفۂ قالبیہ کی تربیت کا اثر یہ ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل پر کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ کان آنکھ زبان بلکہ تمام اعضاء کے استعمال میں محبوب کی پسند کو سامنے رکھتا ہے اس کے کان کوئی نامناسب آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اس کی آنکھ کسی ناروا منظر کی طرف اٹھ نہیں سکتی خواہ وہ کتنا مرغوب ہی کیوں نہ ہو اس کی زبان سے نامناسب کلمات ادا نہیں ہو سکتے اس کے پاؤں غلط سمت میں اٹھنے سے انکار کر دیتے ہیں اس کے ہاتھ کسی کی ایذا دہی کے لئے گویا شل ہو جاتے ہیں اس کی سوچ کا نقطہ ماسکہ رضائے الٰہی کے حصول کی تدابیر کے سوا کچھ نہیں رہتا

اگر تزکیۂ باطن نہ ہوا یا ایسا ہو کہ لطیفۂ قالبیہ پر اثر انداز نہ ہو تو انسان کی حالت بالکل اسی طرح ہو جاتی ہے جیسے کسی موٹر کا ٹائی راڈ کھل گیا ہو سٹیرنگ گو ڈرائیور کے ہاتھ میں ہے مگر موٹر اس کے بس میں نہیں کسی دیوار سے ٹکرائے یا کسی کھڈ میں گرے ڈرائیور اسے روک نہیں سکتا۔ ایسے مناظر دیکھنے ہوں تو اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیں نوجوان نسل کے مشاغل پر نگاہ کریں آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے ان بے چاروں کے ٹائی راڈ کھل چکے ہیں بلکہ سرے سے موجود ہی نہیں۔

ریڈیو یا ٹرانسسٹر کے گرد جمع نوجوانوں کو دیکھیے جب کسی گانے کا آغاز ہونے لگتا ہے تو پہلے ساز بجتا ہے اس پر مقابلے

ہوتے ہیں گانا شروع نہیں ہوا۔ مگر جوان بتا دیتے ہیں یہ فلاں فلم کا گانا ہے فلاں مغنیہ نے گایا ہے۔ نگاہیں آوارہ ہو چکی ہیں کان اس زہر کے رسیا ہو چکے ہیں بڑے بوڑھے کچھ عرصے پہلے ان مناظر کو دیکھتے تھے مگر ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے رہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ خاندان کے بڑے اپنے کینے کو لے کر بڑے اہتمام سے ریڈیو اور ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے اور فحش گانوں اور عریاں تصاویر کو دیکھ کر لطف اندوز ہونے میں جوانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں گویا اب ڈرائیور نے بھی سٹیرنگ سے ہاتھ اٹھا لیا اور کہنے لگے ہیں۔

تو بھی بدل اے امیر زمانہ بدل گیا ہے

آپ کہیں گے ایسا محتاط اور اس درجے کا ہوشیار کون ہو سکتا ہے کہ اس کے جسم کے کسی حصہ سے کوئی لغزش نہ ہونے پائے واقعی ایسا کوئی نہیں یہ کام صرف انبیائے کرام ہی کا ہے درست۔ مگر اس کا علاج بھی حکیم مطلق کے نمائندے نے بتایا ہے کہ لغزش اور ڈھٹائی میں فرق ہوتا ہے غلطی اور مستی دو مختلف چیزیں ہیں ڈھٹائی خودکشی ہے لغزش بیماری ہے اور ہر بیماری کا علاج موجود ہے اس کا علاج بتانے والے نے بتایا کہ

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ

یعنی جو ٹھوکر کھا کر پچھتایا جسے لغزش کے بعد ندامت ہوئی اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ جیسے لغزش سرزد ہوئی ہی نہیں اس انابت کے بعد اگر تلافی مافات کے لئے کوشاں ہو گیا تو اعلان ہے کہ:

انّ الحسنات یذھبن السّیئات

کہ اطاعت و انابت لغزش کے اثر کو محو کر دیتی ہے ممکن ہے حساس آدمی اس سے بھی کسمائیں کہ نیکیوں نے برائیوں کو مٹا دیا مگر برائی کا نشان تو پکار پکار کر کہے گا کہ پہلے یہ حرکت ہوئی کیا منہ دکھائیں گے مگر اللہ بڑا کریم ہے وہ تو برائی کا نشان بھی محو کر دے گا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ اس نے اپنے شاہکار انسان کو وہ عقل عطا فرمائی کہ وہ اپنی برائیوں کو خود اس طرح محو کر سکتا ہے کہ اس کا نشان تک نہیں رہنے دیتا آپ پوچھیں گے وہ کیسے دیکھئے کسی گانے کے رسیا نے کوئی فحش گانا ٹیپ کر لیا کہ جب جی چاہا سن کے مزے لیں گے مگر اس کے ضمیر نے کچوکا دیا انسانیت جاگ اٹھی خیال آیا اس ریل کو ضائع کر دیں مگر مادی ذہن ایسے نقصان کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہو تجویز سوچی کہ اس پر کسی اچھے قاری کی قرأت یا کوئی نعتیہ کلام ہی ریکارڈ کر لیں ایسا کر ڈالا دیکھئے وہی کیسٹ ہے جس پر فحش گانا ٹیپ کیا تھا۔ مگر اب اس کا نشان تک باقی نہ رہا اسی طرح نیکیاں برائیوں کو محو کر دیں تو کیا بعید ہے بلکہ اس کی شان کے لائق یہی ہے ایک اور مژدہ سنیئے ارشاد ہوتا ہے:

خیر الخطائین التوابون

خطا کار بُرے سہی مگر ان بُروں میں سے کچھ اچھے ہیں وہ کون؟ وہ خطا کار جن سے لغزش ہو جائے تو اہلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر اکڑتے نہیں اس پر اصرار نہیں کرتے بلکہ نادم ہو کر گڑگڑا کر اپنے رب سے معافی مانگتے ہیں۔ اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم مصمم کر لیتے ہیں۔

لطیفۂ قالبیہ کے راسخ ہونے پر سالک کو اپنی عملی زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ لینا ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی کہ باطن کے تزکیہ نے اس کے ظاہر کو بھی بدلا ہے یا نہیں گویا سلوک کی ابتداء ہی یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن کو سنوار دیتا ہے۔ انفرادی طور پر وہ ایک اچھا انسان اور اجتماعی اعتبار

سے وہ معاشرے کا بہترین فرد بن جاتا ہے۔

مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں۔

"جب باطن میں انوار جاگزیں ہوتے ہیں تو اعضاء اس کی شہادت دیتے ہیں۔"

سلوک کی بنیاد یہ لطائف ہیں۔ اس لئے تصوف و سلوک کی تربیت کے لئے ہر مکتب فکر میں ابتدائی طور پر یہ لطائف کرائے جاتے ہیں قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ ہر سلسلہ میں ان لطائف کو سلوک کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اور ان لطائف کی تربیت ذکر الٰہی ہے نقشبندیہ میں ابتدائی ہی سے ذکر خفی کرتے ہیں اور انتہا بھی ذکر خفی پر ہوتی ہے باقی سلسلوں میں مبتدی کو ذکر لسانی جہری کرایا جاتا ہے۔ ذکر جہر جسے حنفیہ کے فتاویٰ شامی میں بدعت کہا گیا ہے وہ کسی سلسلے کے کسی محقق نے کبھی نہیں کرایا اور جو جہر بدعت نہیں وہی کراتے ہیں اس کے لئے بھی چند شرائط ہیں اول جہر مفرط نہ ہو زیادہ سے زیادہ جہر متوسط ہو دوم اس جہر سے کسی کی نیند آرام یا عبادت میں خلل نہ آئے اگر کسی مبتدی کی پراگندہ خیالی جہر متوسط سے دور نہ ہو یا اسے یکسوئی حاصل نہ ہو سکے تو اسے آبادی سے دور بھیج دیتے ہیں کہ وہاں جاکر تدبیر کی حد تک اتنی اونچی آواز سے ذکر کرے کہ خیالات کی پراگندگی دور ہو جائے

ذکر الٰہی یا تو نفی اثبات کا کرایا جاتا ہے یا اسم ذات کا پھر نفی اثبات میں بھی ذکر کے چار درجے رکھے اول ذکر ناسوتی یعنی لا الٰہ الا اللہ دوسرا ذکر ملکوتی الا اللہ تیسرا ذکر جبروتی اللہ چوتھا لاہوتی یعنی ھُو ھُو نقشبندیہ میں زیادہ تر ذکر اسم ذات ہی کرایا جاتا ہے باقی سلسلوں میں بھی ذکر جہر صرف مبتدی کے لئے ہوتا ہے بعد میں سب ذکر خفی کراتے ہیں کیونکہ اصل ذکر تو ذکر خفی قلبی ہے۔ اس کی فضیلت حدیثوں میں بیان ہوئی ہے۔ سب لطائف جاری ہو گئے گویا روح میں وہ قوت پیدا ہو گئی کہ ایک طرف جسم کے اعمال کو صحیح سمت پر لگا دے دوسرا اس میں قوت پرواز ہو گئی کہ اپنے وطن اصلی کی طرف سرگرم سفر ہو سکے اور لطیفہ قالبیہ میں یہ استعداد پیدا ہو گئی جسم اور اس کے اعضاء روح کی اس باطنی قوت کے بل بوتے پر اور اس کی رہنمائی صحیح رُخ پر حرکت کرنے لگیں یعنی فکر صحیح ہو گئی سوچ درست ہو گئی اللہ تعالیٰ پر یقین پختہ ہو گیا اخلاق سنور گئے معاملات میں کھرا پن آگیا یعنی انسان صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ بن کر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گیا۔

ساتویں لطائف پر باری باری توجہ کر کے ذکر الٰہی کرنے کے بعد پھر لطیفۂ قلب پر توجہ کر کے ذکر الٰہی کرایا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سب ظاہری اور باطنی خوبیوں کا اصل مرکز یہ قلب ہی تو ہے جس کے متعلق ارشاد نبویؐ ہے کہ یہ درست ہوا تو سارا نظام درست ہو گیا اور یہ بگڑا تو سارا نظام بگڑ گیا اصل سرچشمہ یہی ہے جس سے فکر و عمل کے سوتے پھوٹتے ہیں ساری روحانی قوت کا ذخیرہ اسی میں رکھا جاتا ہے تمام سسٹم اسی میں بھری جاتی ہے ایک طرف تو یہ سارے سبق کا اعادہ ہے دوسری طرف اس حقیقت کو از بر کرنا کہ ساری کوشش اس کے سنوارنے میں صرف کرنی ہے اس کے برعکس باقی سارے لطائف پر پڑتا ہے یہ جو کہا جاتا ہے کہ ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است
ز ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

یار لوگوں نے اسے عمل سے جی چرانے کا بہانہ بنا لیا ہے حالانکہ دل سے مراد دل خود ہے یعنی اپنے دل پر اپنے جذبات

پر اپنے ارادوں پر اپنی خواہشات پر قابو پانا سیکھو اس پر کنٹرول کرنے کا سلیقہ اپناؤ۔ ورنہ دل میں آوارگی کے جذبات ہیں، ارادے متزلزل ہیں خواہشات میں سفلی رجحان ہیں تو اس غلیظ کو لے کر کعبہ بھی جاؤ گے تو کونسی دولت سمیٹ کے لاؤ گے گندے برتن میں تو کوئی پانی ڈال کر پینا بھی گوارا نہیں کرتا کعبہ جا کر کعبہ والے کی محبت کے لئے پہلے اپنے دل کا ظرف تو اس قابل بنا لو۔ اس کا رُخ تو سیدھا کر لو۔ اگر اس کا رُخ غیر کی طرف رہا تو یہ جسم کو کعبہ اللہ کی طرف اللہ کی رضا کی طرف، اللہ کے قرب کی طرف اللہ کی محبت کی طرف قدم اُٹھانے پر آمادہ کر سکے گا

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

آپ کہیں گے کہ لوگ لطائف چھوڑ، سلوک کے اونچے مقامات پر پہنچ جانے کے مدعی ہوتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی اس کی شہادت نہیں دیتی بلکہ ان کے عمل کو لوگ ہدف ملامت بناتے ہیں اور تصوف سلوک پر پھبتیاں کستے ہیں اسے رہبانیت قرار دیتے ہیں بے عملی کا طعنہ دیتے ہیں معاشرے کے لئے ایک بوجھ خیال کرتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟

تو اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ دعویٰ اور حقیقت میں فاصلہ ہوتا ہے ہر دعویٰ زبان سے نکلتے ہی حقیقت نہیں بن جایا کرتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ چیز جتنی قیمتی ہو اسی مناسبت سے اس کی نقالی بھی ہوتی ہے۔ جعل ساز حرکت میں آ جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جعلی کرنسی تیار ہو جاتی ہے مگر جعل ساز نقلی پیسے نہیں بنایا کرتے وہ کوشش کرتے ہیں کہ سو کا نوٹ بنے یا کم از کم پچاس کا تو ضرور بنے وہ لاکھ کوشش کریں آخر پکڑے جاتے ہیں یا کم از کم جعلی نوٹ تو پہچان لئے جاتے ہیں ان جعل سازوں کی وجہ سے اگر کوئی اصل کرنسی کا ہی انکار کر بیٹھے تو ذرا ایسا کر کے دیکھے اس کی زندگی کی ضرورتیں کیونکر پوری ہوتی ہیں۔

پھر دیکھئے کتنے عطائی اور مجیع باز شہروں اور بستیوں میں مجمع لگائے دکھائی دیتے ہیں دوائیں بیچ رہے ہیں آنکھوں کے آپریشن کرتے پھرتے ہیں۔ سادہ لوح مخلوق ان کی چرب زبانی کی وجہ سے دھوکا کھا جاتی ہے مگر انہیں دیکھ کر کوئی شخص فن طب اور میڈیکل سائنس کی افادیت کا انکار کر دے تو اسے کون عقل مند کہے گا اس لئے نقل کو دیکھ کر اصل سے دل برداشتہ ہو جانا بھلا کہاں کی دانش مندی ہے۔

اصل کے نمونے دیکھنا چاہو تو تاریخ کے اوراق میں جھانک کر دیکھو، ان لوگوں کی زندگی کا ایک پہلو دعوت و تبلیغ ہی دیکھو اور یہ پہلو انسانیت کی اصل خیر خواہی اور حقیقی خدمت ہے اپنے ملک کے حالات پڑھئے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ شیخ اسماعیل لاہوری ۱۰۰۵ھ میں لاہور آئے ان کی دعوت سے ہر روز سینکڑوں آدمی اسلام قبول کرتے تھے۔

۲۔ سید علی ہجویری ؒ ۱۰۷۲ء غزنوی دور میں دعوت تبلیغ کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر آئے اور لاہور میں دین حق پھیلایا۔

۳۔ خواجہ معین الدین چشتی ؒ ۱۲۳۶ء کے حالات دیکھئے صرف ایک سفر میں دہلی سے اجمیر جاتے ہوئے ۷۰۰ ہندوان کے ہاتھ پر اسلام لائے۔

۴۔ بو علی قلندر ؒ ۱۳۲۴ء پانی پت کے راجپوتوں کو مسلمان کیا۔

۵۔ بہاؤالدین زکریا ملتانی ؒ ۱۱۸۵ء ملتان کے مضافات کو نور اسلام سے منور کیا۔

۶۔ سید جلال بخاری ؒ ۱۳۴۲ھ اوچ میں آئے جھنگ شہر آباد کیا

راجپوتوں کے کئی قبیلوں کو مسلمان کیا۔

٧۔ سید جلال الدینؒ بخاری کے ہاتھ پر کاشغر کا بادشاہ تیمور خان ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا

٨۔ سید جلال الدین تبریزی نے ١٢٤٤ء بنگال میں اسلام پھیلایا۔ سندھ میں سید یوسف الدین نے دس برس میں ٧٠٠ خاندان مسلمان کئے یہ فہرست بڑی طویل ہے شوق ہو تو آرنلڈ کی کا مطالعہ کیجئے۔

اپنے ملک میں خاندان ولی اللہؒ کی خدمات کا جائزہ لیجئے علمی خدمات کے علاوہ ارباب اقتدار کے ہاتھوں جو مصائب دیکھے ان کا انکار کوئی کیسے کرسکتا ہے۔

حضرت مجددالف ثانی رح کے حالات پڑھیے کسی راہب یا تارک دنیا کو کوئی حکمران بھلا قید و بند کا تحفہ دیتا ہے۔ مغل شہنشاہ جہانگیر کو آخر ایک "راہب" کے آگے جھک جانے کی کیا مجبوری تھی۔

کوئی کہاں تک شمار کرے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنے کا سلیقہ سیکھئے اور نقل سے دھوکا کھا کر اصل کا انکار کر دینے کی جرأت نہ کیجئے

حقیقی تصوف و سلوک کا خاصہ ہے کہ انسان کو صحیح معنوں میں عملی انسان بنا دیتا ہے وہ اللہ کا بندہ اور مخلوق کا خادم بن کر اللہ کی زمین پر زندگی کے دن گزارتا ہے ۔

سعادت روح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں
کہ کالج میں کوئی اس علم کا ماہر نہیں ہوتا

دینی، روحانی، اخلاقی جلا کے لئے

ماہنامہ

المرشد چکوال

کا مطالعہ کرنا آپ کے اور بچوں، بچیوں کے لئے یقیناً ضروری بلکہ اشد ضروری ہے۔

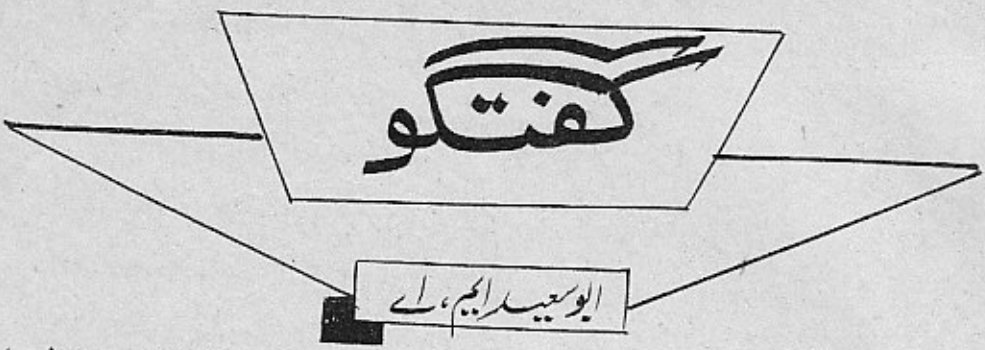

گفتگو

ابو سعید ایم، اے

سوال ۱: توبہ سراسر ایک عمل ہے، قول نہیں محض زبان سے یا اللہ میری توبہ کہنے کا نام نہیں اور نہ سینکڑوں بار گن گن کر استغفار پڑھنا ہے۔

۲۔ ہر غلط روش سے توبہ کے لئے ایک مدت مقرر ہوتی ہے اسے مہلت کا وقفہ کہہ لیجئے، یہ مدت گذر جانے کے بعد توبہ بے معنی بن جاتی ہے۔

۳۔ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیئات۔ یعنی اعمال صالحہ میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ غلط اعمال کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ کریں اسی کو توبہ کہتے ہیں یعنی غلط کام کے نقصان رساں نتائج کی تلافی کے لئے صحیح کام کرنا۔

۴۔ ایک شکل یہ ہے کہ آپ نے شراب پی لی۔ کچھ وقت کے بعد آپ کو اپنی غلط کاری کا احساس ہوتا۔ اس میں توبہ کی شکل یہ ہے کہ آپ اپنے عمل پر نادم ہوں اور آئندہ کبھی اس کے مرتکب نہ ہوں۔

۵۔ ایک شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی کا حق دبا لیا کچھ عرصے کے بعد آپ کو اپنی اس غلط حرکت کا احساس ہوا آپ کے دل میں ندامت کے جذبات بیدار ہوئے۔ آپ کی توبہ کی شکل یہ ہے کہ آپ اس شخص کا حق اسے واپس دیں اور آئندہ کے لیے عزم کریں کہ آپ کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کریں گے۔ یہ توبہ کا حقیقی مفہوم ہے۔ گن گن کر استغفار پڑھتے رہنا توبہ نہیں ہے۔

الجواب: توبہ کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ توبہ انسان کی شخصیت میں ایک صالح انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کا نام ہے، سیرت و کردار میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہونے کے مختلف مراحل ہیں جن میں ایک فطری ترتیب پائی جاتی ہے انقلاب کی تحریک دل کی گہرائیوں میں ہوتی ہے۔ پھر ارادہ پیدا ہوتا ہے، پھر اعضاء و جوارح حرکت میں آتے ہیں۔ اس تبدیلی میں دل، دماغ، ہاتھ پاؤں، زبان آنکھ کان بلکہ تمام اعضاء انسانی اور اس سے آگے بڑھ کر مال و دولت اثر و رسوخ سب کا حصہ ہوتا ہے اس سارے عمل کی ترتیب کچھ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ:۔

اوّل:۔ دل میں ندامت کا احساس اور ترک گناہ کا عزم پیدا ہوتا ہے یہ دل کا فعل ہے۔

دوم: اس صالح تبدیلی کے جذبے اور قلبی ارادہ کو ذہن اور دماغ نے معقول قرار دیا اور اسے اختیار کرنے کی تائید کر دی۔ یہ ذہن کا فعل ہے۔

سوم: احساسِ ندامت کے ساتھ اپنے رب کے سامنے اپنے

جُرم کا اقرار کیا اور معافی کی درخواست کی یہ زبان کا فعل ہے اس کے بعد توبہ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں :-

(ا) اگر وہ گناہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتا ہے تو اس احساس و اقرار کے ساتھ کثرت استغفار پابندیٔ شریعت کا اہتمام گناہوں سے اجتناب کی کوشش یہ سب توبہ کی صورتیں ہیں

(ب) اگر وہ گناہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے تو سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ جس کا حق مارا ہے اسے ادا کرنا ہے اور اس کی اس دل آزاری کے لئے اس سے معافی مانگنا ہے اگر اس کا حق ادا نہ ہو سکے تو اس کی منت سماجت کر کے اپنی مجبوری اور بے بسی کا یقین دلا کر اس سے حقوق معاف کرانا ہے۔ اور اگر وہ شخص فوت ہو چکا ہو تو اس کے ورثا کو اس کا حق پہنچانا ہے مگر اس کے ساتھ ہی دوسرا کام یہ کرنا ہے کہ اپنے رب سے بھی معافی مانگنا ہے، استغفار کرنا ہے کیونکہ حقوق العباد میں کوتاہی یا غلطی کرنے میں بھی دراصل اللہ تعالےٰ کی نافرمانی ہے، کیونکہ یہ حقوق العباد بھی تو اس نے مقرر فرمائے ہیں اور انہیں ادا کرنے کا حکم اسی نے دیا ہے واللہ اعلم۔

توبہ کے مفہوم کو سمجھنے میں جو ٹھوکر لگتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح اور غلط کو خلط ملط کر کے ایک کامل چیز کو ناقص بنا کے پیش کیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ توبہ ایک عمل ہے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس عمل کے ذرائع اور آلات انسانی اعضاء ہی تو ہیں پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ توبہ کے عمل میں ایک انسانی جزو یعنی زبان کو اس عمل میں حصہ لینے کی اجازت نہیں یا اس کے حصہ کا انکار کیا جا رہا ہے یا اسے فضول اور بے کار قرار دیا جا رہا ہے؟

اگر زبان بھی جسم انسانی کا ایک عضو ہے تو توبہ کے عمل میں اسے شریک نہ کرنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ جب زبان گناہ میں شریک ہو سکتی ہے تو توبہ میں کیوں نہ شریک ہو۔

آپ گناہ کے احساس اور اس پر ندامت کو توبہ کے عمل کی بنیاد بناتے ہیں اور یہ دونوں دل کے فعل ہیں۔ دل کے فعل کو تو آپ عمل شمار کرتے ہیں اگر زبان کے فعل کے عمل ہونے کا انکار کرتے ہیں یہ عجیب دورنگی ہے! قرآن حکیم کی تعلیمات سے توبہ کا نقشہ آپ کے نقشہ سے مختلف نظر آتا ہے مثلاً ارشاد باری ہے۔

ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما ہ

(۴) اس کا نقشہ یوں سمجھ میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے گناہ کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

آپ کے لئے "توبہ ایک عمل ہے" کے کلیہ کے مطابق کرنے کا کام بس اتنا تھا کہ انہیں گناہ کا احساس ہوتا، ندامت ہوتی تلافی ہوتی اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم ہوتا ہے تو توبہ کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

یہاں اللہ تعالےٰ شرط لگا رہے ہیں کہ اے نبیؐ! اگر یہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، پھر اللہ سے معافی مانگتے دوسری شرط کہ اللہ کا رسول بھی ان کے لئے معافی مانگتا پھر اس شرط کی جزا یہ بیان فرمائی کہ لوجدوا اللہ توابا رحیما یعنی اللہ اپنی رحمت سے ضرور ان کی توبہ قبول کر لیتا۔

سوال یہ ہے کہ گناہ کرنے والوں نے گناہ کیا گھر بیٹھ کے تلافی کرتے، جاؤک یعنی تیرے پاس آنے کی ضرورت کیا تھی۔ پھر اللہ سے معافی کیسے مانگتے معافی مانگنے کے لئے

"یا اللہ میری توبہ" کہنا تو آپ کے نزدیک توبہ کے منافی بلکہ توبہ
کی توہین ہے۔ اور گن گن کر استغفار پڑھنا فعل عبث ہے
تو نبی کریمؐ کے پاس آ کر اللہ سے معافی مانگنے اور توبہ کرنے کی
صورت کونسی ہے جو وہ اختیار کرتے اصل کام توبہ تھا کہ انہیں
ندامت ہوتی آئندہ اس گناہ کے مرتکب نہ ہوتے یہ کام تو گھر بیٹھ
کے کر سکتے تھے۔

پھر دوسری مشکل یہ ہے کہ نبی کریمؐ آپ کے لئے معافی
مانگتے۔ یہ بات آپ کے خیال کے مطابق تو پہلی سے بھی عجیب
ہے۔ گناہ انہوں نے کیا استغفار نبی کرے۔ آپ کے نظریے
کے مطابق یہ دونوں کام توبہ کی حقیقت سے کوسوں دور ہیں
لہذا توبہ کے قبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اس کا
کیا کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس صورت میں توبہ کرنے سے توبہ
قبول کرنے کا یقین دلا رہے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے
کہ اللہ کے ہاں توبہ قبول کرنے کا اصول اور توبہ کا مفہوم اس
سے بالکل مختلف ہے جو آج کل کے کسی ماڈرن مفسر کے ذہن
نے تیار کیا ہے

۲۔ ارشاد باری ہے: کانوا قلیلا من اللیل ما
یھجعون۔ وبالاسحار ھم یستغفرون ۰

یعنی وہ لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں جو رات کو کم
سوتے ہیں اور سحر کے وقت استغفار کیا کرتے ہیں
سوچنے کی بات یہ ہے کہ بقول آپ کے توبہ ایک عمل ہے،
زبان سے یا اللہ میری توبہ کہنے اور سینکڑوں بار گن گن کر
استغفار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تو اللہ کے پسندیدہ
لوگ سحر کے وقت استغفار کیسے کیا کرتے ہیں اگر انہوں نے
شراب پی ہو تو توبہ کا عمل یوں ہوا کہ سحر کے وقت اٹھ کے
اس جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اگر کسی کا حق مارا ہے تو سحر
کے وقت اٹھ کے حق ادا کیا کرتے ہیں اور اگر مظلوم کی تلاش
میں سحر کا وقت ختم ہو جائے آفتاب طلوع ہو جائے تو توبہ
کا عمل کرنے کا وقت ختم ہو گیا ان کی محرومی کا کیا کہنا۔

۳۔ فنادیٰ فی الظلمٰت ان لا الہ الا انت سبحانک
انی کنت من الظٰلمین

یعنی حضرت یونسؑ کے تہہ بہ تہہ اندھیروں میں ندا کی
خدا جانے انہوں نے کیسے ندا کی، زبان سے معافی مانگنا
تو بے سود ہے کیونکہ توبہ ایک عمل ہے مگر اس عمل کے دوران
اگر غلطی سے بھی زبان کو حرکت دے دی تو بات بگڑ گئی
لہذا ان کی یہ ندا ماڈرن مسلمان کی نگاہ میں صدا بصحرا
ہے۔ مگر جس کو ندا کی اس نے بتا دیا کہ نا سمجھنا لئے
کہ ہم نے ان کی ندا کا جواب قبولیت سے دیدیا۔
عجیب کشمکش ہے کہ اللہ کی بات مانو تو ندا کا قبولیت پر منتج ہوتا
نظر آتا ہے اور ماڈرن مفسر قرآن کی بات مانو تو بے کار
مشغلہ نظر آتا ہے، پھر بھی آپ کو اصرار ہے کہ اللہ کسی کی
نہ مانو ہماری مانو۔ البتہ اگر تمہیں اللہ کی بات بھی ماننا ہو تو
یوں نہ مانو جیسے اللہ یا اس کا رسول کہتا ہے بلکہ یوں مانو جیسے ماڈرن علامی کہتا ہے
توبہ ہی صرف ایک عمل نہیں بلکہ اسلام تو سارے کا سارا
عمل ہے۔ اگر توبہ کے عمل میں زبان کا کوئی حصہ نہیں تو سارے
دین میں زبان کا کیا حصہ ہوگا۔ اصول اور کلیہ تو خوب ہے مگر
عملاً بات الجھ جاتی ہے۔ فرض کیجئے ایک آدمی اپنی عملی زندگی
مکمل طور پر اسلام کی تعلیمات کے مطابق بسر کرتا ہے مگر زبان
سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بالکل نہیں کہتا اسے
کیا سمجھا جائے گا۔؟ کیا قانون کی نگاہ میں وہ مسلمان ہے

وہی حقوق ملیں گے جو ایک مسلم معاشرہ میں مسلمان فرد کو ملتے ہیں؟ اس کے برعکس ایک شخص زبان سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتا ہے۔ شریعت اور قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تجدد پسند حضرات دین کو اس ستم ظریفی کا شغلہ نہ بناتے۔

حضور اکرمؐ فرماتے ہیں انی لا استغفر اللہ فی الیوم مائۃ مرۃ یعنی میں روزانہ سو مرتبہ استغفار پڑھتا ہوں مگر وہ کیوں؟ ہمارے دانشور کہتے ہیں گن گن کے سینکڑوں مرتبہ استغفار کرنا ایک فعل عبث ہے لہذا لازم آتا ہے کہ حضور اکرمؐ روزانہ ۱۰۰ مرتبہ اللہ اور مخلوق کے غصب شدہ حقوق کی تلافی کرتے تھے اعاذنا اللہ من ھذہ الخرافات۔

اگر حضور اکرمؐ کو خاتم النبیین تسلیم کیا جائے تو گن گن کر سینکڑوں مرتبہ استغفار کرنا ایک محمود فعل اور اتباع سنت شمار ہوگا۔ اور اگر آج کے کسی برخود غلط کو شارع تسلیم کیا جائے تو ایسا کرنا فعل عبث کے ہوگا۔

اب مسلمان خود فیصلہ کرے کہ ان میں سے منصب نبوت پر فائز کون ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دعا کو سید الاستغفار فرمایا ہے اس میں تعلیم یہ دی ہے کہ ومن قالھا من النھار موقنا بھا فمات من یومہ قبل ان یمسی فھو من اھل الجنۃ لفظ قالھا قابل غور ہے کہ قول تو زبان ہی کا فعل ہے ہاں اس قول کے ساتھ یقین قلبی شامل ہونا لازمی ہے مگر اس کا کیا جائے کہ تجدد پسند حضرات کا اس پر اصرار ہے کہ دل صاف ہونا چاہیے باقی سب خرافات ہے۔

ان الحسنات یذھبن السیئات ایک ایسا اصول یا کلیہ ہے جو رب العالمین نے ارشاد فرمایا ہے مگر اس کلیے کا اطلاق جب اس کے بتانے والے سے بے نیاز ہو کر اپنی عقل جزدی سے کیا جائے گا

تو اس قسم کی الجھنیں لازماً پیدا ہوں گی۔ اس اصول کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے الحسنات کے مفہوم کا تعین ضروری ہے الحسنات وہ افعال ہیں جنھیں اللہ اور رسول حسن قرار دیں توبہ کے ضمن میں مذکورہ بالا آیات واحادیث سے ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول نے اللہ سے معافی مانگنے اور کثرت استغفار کے عمل کو پسندیدہ عمل قرار دیا ہے اللہ نے اپنے ان بندوں کی تعریف فرمائی ہے جو راتوں کو جاگ کر اللہ کی عبادت کرتے اور سحر کے وقت اللہ سے استغفار کرتے ہیں۔ پھر رسول کریمؐ نے وضاحت فرمائی کہ میں روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں اب آدمی سوچے کہ اس کلیے کے اطلاق کی یہ کونسی صورت ہے کہ اللہ اور رسول نے جس کو الحسنات کی فہرست میں درج فرمایا ہے اسے کوئی دانشور سیئات میں شمار کرنے لگے یہاں روکنے والا کوئی نہیں مگر اس روز کا آنا یقینی ہے جب دین کے معاملہ میں اس قسم کی دھاندلیوں کے متعلق ضرور باز پرس ہوگی

زبان کے استعمال اور اس سے نکلے ہوئے الفاظ کو بے معنی قرار دینا یا بے وزن سمجھنا روزہ کی عملی زندگی میں ممکن نہیں پایا جاتا فرض کیجئے کوئی اکھڑ آدمی کسی ایسے دانشور کو ماں کی گالی دیتا ہے اگر وہ دانشور اس سے الجھتے ہیں تو وہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب بہادر! میں نے زبان سے چند الفاظ ہی تو نکالے ہیں کوئی عملی اقدام نہیں کیا تو زبان کے اس بے کار فعل پر آپ سیخ پا کیوں ہوتے ہیں سوچیے کہ اس دانشور کا اس کے جواب میں ردعمل کیا ہوگا؟

مسلمانوں میں نکاح کا مسئلہ گھریلو زندگی میں بنیادی اور انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور اس بندھن کے قائم ہونے میں صرف زبان کی حرکت ہی کارفرما نظر آتی ہے اور ایجاب وقبول میں زبان کی ذراسی حرکت سے دو اجنبی آدمیوں میں خاوند اور بیوی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

اگر دانشورانہ انداز میں سوچا جائے تو ظاہر ہے کہ نکاح ایک عمل ہے اس میں زبان سے ایجاب وقبول کا تعلق بے معنی ہے لہذا آزادی ہے کہ آدمی جب چاہے جس کے ساتھ چاہے زناشوئی کا عمل اختیار کرنے لگے محض زبان کو حرکت دینے سے نہ مرد خاوند بنتا ہے نہ عورت بیوی کیونکہ یہ تو الگ عمل ہے۔

اسی طرح گھریلو زندگی میں بگاڑ پیدا ہونے کی صورت میں آخری علاج جو اللہ و رسول کی طرف سے بتایا گیا وہ طلاق ہے اور یہ فعل بھی مسلمانوں میں زبان ہی سے ہوتا ہے آدمی اگر دانشور بن جائے تو اسے اس پر اصرار ہوگا کہ زبان سے ایک دفعہ نہیں جتنی دفعہ چاہو گن گن کر طلاق دیتے رہو کچھ نہیں ہوگا کیونکہ یہ تو الگ عمل ہے۔ لہذا عمل جاری رکھو زبان سے بے شک تین طلاق دیدو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہئے ایسے مادر پدر آزاد معاشرے کو اسلامی معاشرہ کہا جا سکتا ہے؟

اگر کسی نے غلطی سے یا بدتمیزی سے کسی کے تھپڑ مار دیا تو، یا کوئی گزند پہنچا یا تو ندامت کا احساس ہونے پر وہ ضرور معافی مانگے گا چھوٹی موٹی حماقتیں کر کے ہے۔ سوری کہہ دو تو معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے آخر ایسا کیوں ہے! اس لفظ میں اتنی قوت کہاں سے آگئی کہ مظلوم کو تکلیف ہی بھول گئی مگر یہ عجیب دو رنگی ہے کہ ایسے موقع پر انسانی حقوق کو پامال کرنے والا سوری (SORRY) کہہ دے تو مہذب شمار ہو اور اس کا یہ کہنا وزنی تصور ہو مگر اللہ کے حقوق پامال کرنے والا احساسِ ندامت کے ساتھ اگر استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ کہہ دے تو وہ سمجھ پر غیر مہذب مگر گردن زدنی قرار دیا جائے۔

مختصر یہ کہ توبہ کی تین صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ دل میں ندامت کا احساس پیدا ہو اور زبان سے اسی احساس کے ساتھ معافی مانگے۔ دوم یہ نقصان کی تلافی کرے جبکہ تلافی کا امکان ہو، سوم یہ کہ آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم مصمم کرے۔

خدایا! ایں کرم بار دگر کن

(سفرِ حرمین کے تاثرات)

قسط ۲

دیارِ حبیبؐ میں داخلہ

جونہی اس زمین میں قدم رکھا اندر سے آواز آئی کہ صرف اتنا نہیں ہوا کہ تم سمندر پار کر کے ایک نئی سرزمین میں پہنچ گئے ہو جغرافیائی حدود بدل گئی ہیں دنیا کے نقشے پر اس سرزمین کا نام مختلف الفاظ سے لکھا ہوا ہے بلکہ ہوا یہ ہے کہ تم ربّ العالمین کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے اس کے گھر کی حدود میں داخل ہو چکے ہو دربار کے آداب کا خیال رکھنا پھر یہ ربّ العالمین کا دربار محبوبِ حقیقی کا گھر ہے اور تم بلائے ہوئے آئے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی بدتمیزی کی وجہ سے عتاب کے مستحق بن کر لوٹو اس لئے سراپا نیاز بن کر کہو:

غریبے دردمندے نے نوازے
سوزِ لقمۂ خود در گدازے
تو می دانی چہ می جوید چہ خواہد
دلے از ہر دو عالم بے نیازے

پھر کہو:

ہر کس بہ ہوائے خود خواہد ز تو مقصودے

اے جملہ طفیل تو من از تو ترا خواہم

لو! حسن اتفاق دیکھو سحر کا وقت ہے محبوب کا گھر ہے اس کا در ہے تہجد پڑھے اور اپنے قلب و نظر کو دل و دماغ کو حاضری کے لئے تیار کیا اور تضرع و زاری سے التجا کی کہ ہمارا آنا قبول ہو اور ہمارے ظاہر و باطن پر وہ رنگ چڑھے جو تجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً"

نماز فجر سے فارغ ہوئے تو ایک مرحلہ اور سامنے تھا کہ بینک ڈرافٹ کیش کرانے میں ہر غریب الدیار کو زر مبادلہ کا مسئلہ پیش آتا ہے لوگ زر مبادلہ کا انتظام پہلے کرتے ہیں پھر سفر پر روانہ ہوتے ہیں کیونکہ ہر ملک کی کرنسی اپنی ہے اور ملکی کرنسی کے بغیر کوئی دوسری کرنسی یہاں کام نہیں دے سکتی خواہ لاکھوں موجود ہوں۔ مگر حد ہے بوالعجبی کہ ہمیں جس غیر ملک میں لازماً جانا اور ہمیشہ رہنا ہے اس کے لئے زر مبادلہ کے حصول کی فکر بہت کم ہی دیکھنے میں آئی ہے حالانکہ وہاں کی کرنسی کی نشاندہی تو سرکار نے کردی ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَشْتَہِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَدَّعُوْنَ۔

یعنی تم یہاں چند روزہ قیام کے دوران میری مان کر چلو گے تو وہاں ہمیشہ کیلئے میں تمہاری مان کے چلوں گا۔ اور اگر تم یہاں اپنی مرضی کرو گے تو وہاں

جو میں چاہوں گا کروں گا اَتَتكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى اس
اس مرحلے کے طے کرنے میں آٹھ گھنٹے صرف ہو گئے یعنی اس ملک میں قدم
رکھنے پر پہلا سبق یہ دیا گیا کہ تمہیں جہاں ہمیشہ رہنا ہے وہاں کے لئے زرمبادلہ
حاصل کرنے اور جمع کرنے کی فکر کرو ورنہ وہاں پچھتانا پڑے گا۔ بڑے بڑے
جغادری بھی وہاں اعتراف کریں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىٓ
اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ خیر خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا اور دوپہر کے قریب جدہ سے
روانہ ہوئے۔ اس راستہ سے نگاہیں آشنا تھیں ذہن میں کچھ یادیں محفوظ تھیں نگاہیں
ان آثار کو ڈھونڈتی رہیں۔ پہلے یہاں ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔
حدائق حدیبیہ اب نگاہیں اسے ڈھونڈتی ہی رہ گئیں۔ اس بورڈ پر
کے دو لفظ طویل داستان چشم تصور کے سامنے لا کھڑا کرتے تھے۔ اسے دیکھتے
ہی ۱۴۰۰ قدسیوں کی جماعت کے ایثار، وفاداری اور شیفتگی کا وہ منظر جو
صدیوں پہلے یہاں پیش آیا تھا۔ فلم کی ریل کی طرح نگاہوں کے سامنے پھرنے
لگتا تھا اور ایک عجیب قسم کا ولولہ پیدا ہوتا تھا۔ مگر انسان! مادہ پرست انسان
حال میں اس قدر کھو گیا ہے کہ ماضی سے کٹ کے رہ گیا ہے اور مستقبل کی
فکر سے آزاد ہو چکا ہے گو وہ بورڈ غائب ہے مگر اس مقام پر بائیں طرف
سڑک سے ذرا ہٹ کے نگاہ کی جائے تو سماں بندھ جاتا ہے اسی مقام پر
مزکی اعظمؐ کے تربیت یافتہ افراد کو وہ سند رضا عطا ہوئی کہ رہتی دنیا تک
اہل ایمان اور اہل دل اس کے الفاظ دہراتے رہیں گے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ

مَافِیْ قُلُوْبِهِمْ۔

یعنی علیم بذات الصدور نے ان کے دلوں کا امتحان کر لیا اس میں کسی قسم کا غل وغش نہیں رہ گیا تھا کیونکہ مزکی اعظم ﷺ نے ان کے تزکیہ قلب کا عمل تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ لہٰذا ان کے لئے اسی وقت چار انعامات کا اعلان کر دیا۔ صرف اتنی سی بات کہ قلب کا رُخ رب العالمین کیطرف کیا۔ اس مزدوری کا اتنا بڑا صلہ صرف رب شکور ہی دے سکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ان جانثاروں نے خود سپردگی کا حق ادا کر دیا اور مزکی اعظم ﷺ نے تزکیہ کرنے میں کسر نہ چھوڑی تو رب کریم کی طرف سے بھلا کمی کیونکر رہتی۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔

حرم میں داخلہ

بہرحال پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے آگے بڑھے اور رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا پڑھتے ہوئے حدودِ حرم میں داخل ہوگئے یعنی مالک کے گھر کی دہلیز پر پہنچ گئے پھر "موقف" پر پہنچنے "فندق زمزم" میں سامان رکھا اور محبوب کی ملاقات کے لئے چل کھڑے ہوئے مسجدِ حرام میں داخل ہونے لگے تو دل لرز کے رہ گیا کہ کہیں یہ آواز نہ آنے لگے ؎

تو بردنِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

دل نے کہا:

اے پناہ من جریم کوئے تو
من بہ اُمیدے رمیدم سوئے تو

صاحب خانہ کتنا کریم ہے کہ سیاہ کاروں کو مایوسی کا شکار ہونے سے

محفوظ رکھنے کے لئے فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ

الٰہی ! مجھے پورا احساس ہے کہ تیرے بغیر کوئی معافی دینے والا نہیں پھر میں تیرا در چھوڑ کے اور جاؤں کہاں تُو تو اتنا کریم ہے کہ بھگوڑوں کو بلاتا ہے۔ اور مُلا بلا کر اپنے دروازے پہ لاتا ہے یوں لگتا ہے جیسے آواز آرہی ہے:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

جب ادھر سے کرم گستری کا یہ عالم ہے تو کیوں نہیں کہتے:

بر در آمد بندۂ بگریختہ
آبروئے خود ز عصیاں ریختہ

مغفرت وارد امید از لطفِ تو
زانکہ خود فرمودۂ لا تقنطوا

اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھو

یا نفس لا تقنطی من زلۃ عظمت
ان الکبائر فی الغفران کاللمم

بیت اللہ پہ جونہی نگاہ پڑی دل بلیوں اچھلنے لگا آنکھوں میں آنسو بھر آئے

زبان سے نکلا ؎

می توانی کہ دہی اشک مرا حسن قبول
اے کہ دُر ساختہ قطرۂ بارانی را

حجرِ اسود کے پاس پہنچ کر طواف شروع کیا۔ اس کے آداب یہ ہیں کہ حجرِ اسود کا بوسہ لیا جائے اور یہاں سے پہلا چکر شروع کیا جائے مگر اتنی بھیڑ تھی حجرِ اسود تک پہنچنا مشکل نظر آیا لہٰذا دور سے ہی اشارہ کر کے طواف شروع کیا دیکھا کہ دھینگا مشتی ہو رہی ہے دھکے دیئے جا رہے ہیں کیونکہ بوسہ لینے کا شوق ہے یہی وہ بیماری ہے جس کا اظہار معاشرے کے ہر طبقے میں ہو رہا ہے بلکہ یہ ذہن معاشرے کی دینی حس کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے یہ ہے SENSE OF PROPORTION کا فقدان یعنی اس امر کا قطعاً خیال نہیں کہ کس کام کو کتنی اہمیت دین میں دی گئی ہے ہوتا یہ ہے کہ کوئی شخص نماز کے قریب نہ جائے تو مضائقہ نہیں مگر نماز میں رفع یدین نہ کرے تو گردن زدنی ہے، شراب کو شیرِ مادر سمجھے تو کوئی حرج نہیں، لیکن انگوٹھے نہ چومے تو سوختنی ہے زنا کو شغل سمجھے تو مہذب ہے مگر نعرۂ حیدری نہ مارے تو کشتنی ہے فرائض کی پرواہ نہیں اور مباحات، پر منظم فسادات ہو رہے ہیں۔ یعنی ہم نے اس ترتیب کو ہی الٹ دیا جو اللہ اور اس کے رسول نے امورِ زندگی میں حکیمانہ طور پر مقرر فرمائی تھی:

اللّٰھُمَّ ارنا الحقَّ حقّاً و ارزقنا اتباعہ
وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

صورت یہ ہے کہ حجرِ اسود کا بوسہ لینا سنت ہے اور ایذائے مسلم حرام ہے۔ گویا حرم میں ایک حرام فعل کا ارتکاب کر کے ایک سُنت ادا کی جاتی ہے جس سنت کی ادائیگی کا ذریعہ فعل حرام ہو، اس اتباع پر جو اجر مرتب ہو سکتا ہے۔ دینے والا ہی بہتر جانتا ہے بات کچھ ایسی بنی کہ:

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

اس کاروائی کی نفسیاتی توجیہ کی جائے تو یہی ہو سکتی ہے کہ یہ حسرت رہ جائیگی کہ کثیر رقم خرچ کی وقت صرف کیا محنت کی اور حجرِ اسود کو چومنا نصیب نہ ہوا تو بس یہ حسرت پوری کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے مگر خطرہ یہ ہے کہ کہیں یہ بات اتباعِ ھویٰ کے تحت نہ آجائے:

اللھم اھدنا الصراط المستقیم

خیر طواف مکمل کیا، ملتزم پر حاضری دی، آبِ زمزم پیا، سعی کے لئے صفا کی طرف چلے اور سعی میں سات چکر پورے کئے حلق یا قصر کیا، احرام کھول دیئے اور آج کی کارروائی مکمل ہوئی۔

۱۱/۳ مکہ مکرمہ میں رہ کر دو کام نہایت ضروری معلوم ہوتے ہیں کم از کم ایک عمرہ تو روزانہ کرنا چاہیئے اور بیت اللہ کا طواف زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیئے کیونکہ طواف بیت اللہ ایسی عبادت ہے جو صرف اسی جگہ ہو سکتی ہے۔ نوافل وغیرہ دوسری عبادات کا موقع ہر جگہ مل سکتا ہے۔ مگر طوافِ کعبہ کی سعادت صرف یہیں حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ یہی طے کر کے آج عمرہ کے لئے تنعیم گئے ایک عزیزہ مرحومہ یہی حسرت لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی کہ حرمین

کی زیارت کا موقع ملے لہٰذا آج اس کی طرف سے عمرہ کیا۔

حجرِ اسود کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کی اشارہ کیا اور طواف شروع کر دیا مگر ان اعمال کی روح سمجھنے کے لئے قلب و ذہن میں حرکت پیدا ہوئی یوں محسوس ہوا جیسے یہ عمل ایک عہد سے شروع ہوتا ہے کہ اللہ اکبر، اللہ سب سے بڑا ہے لا الہ الا اللہ میں عہد کرتا ہوں کہ اللہ کے مقابلے میں کسی کی بات نہیں مانوں گا۔ حجرِ اسود کی طرف بڑھنا ہاتھوں سے مس کرنا ہونٹوں سے چومنا کیا ہے؟ کہ یہ عہد صرف زبان سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ مرے اعضاء جوارح میرے سینے کے اندر دھڑکتا ہوا دل اور میرے جذبات میری ساری کائنات اس عہد میں شامل ہے اور ہر چکر کے شروع میں یہی عہد دہرایا جاتا ہے اور سات چکر گویا میری زندگی میں ہفتے کے سات دن لوٹ لوٹ کر آئیں گے اور ادھر پلٹے گی ادھر میں زندگی کا ہر روز اس عہد کے دہرانے سے شروع کروں گا۔ اور سات چکر کے بعد آخوں استلام ایسا ہی ہے جیسا ہر جمعہ کو اجتماعی صورت میں اس عہد کی تکمیل ہو گی حقیقت کے اعتبار سے اس عمل کی روح یہ ہو یا نہ ہو لیکن ان سات چکروں میں زندگی کے ہر روز کے لئے یہی سبق مل جائے۔

تو زندگی کا نقشہ کیوں نہ بدلے

اللّٰھُمَّ ارزقنا بحرمتہ بنبیک الکریم۔